VOLUME ONE · SEPTEMBER 2026

شمارہ اوّل

ثقافت

فکر، تہذیب اور عصرِ حاضر کا آئینہ



عالمی منظر نامہ / صفحہ ۲۳

مشرقِ وسطیٰ کا بدلتا نقشہ

ہرمز سے باب المندب اور ینبع تک

سائنس و ٹیکنالوجی · صفحہ ۱۳

اے آئی اور اردو کا مستقبل

شخصیات و مطالعہ · صفحہ ۵

ڈاکٹر منظور عالم: ان کہی کہانی

۸۰ صفحات · ۲۷ مکمل تحریریں

SAQAFAT.NET

ثقافت

VOLUME 1, ISSUE 1

EDITOR IN CHIEF

AHMAD JAWED

SECTION EDITORS

TARIQ ABDULLAH
MD KAIF

BACK ISSUE

Saqafat Magazine back issues can be downloaded in digital format from saqafat.net at $5 per issue. Back issues in print format cost $2 for India delivery and $11 for international delivery, subject to availability. Pre-payment is required.

CONTACT

+91 - 991 1942-428
+91 - 852 7572-667

E-MAIL

editorial@saqafat.net

WEBSITE

WWW.SAQAFAT.NET

ADDRESS

Lower Ground Floor, Sultanat Plaza, F-13, Nafees Road, Okhla, New Delhi, IN 110025

STAFF ADDRESS

To contact any of the Saqafat staff members, simply format the address as: firstname@saqafat.net

REPRINTS AND PERMISSIONS

You must have permission before reproducing any material from Saqafat Magazine. Send e-mail requests to publisher@saqafat.net. Please include contact details in your message.

PUBLISHED BY

AHMAD JAWED FOUNDATION
Education · Research · Culture · Social Development

Ahmad Jawed Foundation is a non-profit company registered under Section 8 of the Companies Act, 2013.
Saqafat is published quarterly for one year (4 issues) by Ahmad Jawed Foundation.
Copyright © 2026 All rights reserved.
Published from New Delhi, India.

اس شمارے میں

فکر، معاشرہ، تعلیم اور دنیا۔ ویب سائٹ کے منتخب مضامین، مکمل متن کے ساتھ۔

SEPTEMBER 2026 / COMPLETED OCTOBER 2026

ڈاکٹر محمد منظور عالم: ان کہی کہانی — 5
شخصیات و مطالعہ

ایک موت کی انگنت چیخیں اور اس کا ان سنا سچ — 8
معاشرہ

دینی مدارس کا نصاب و معیار: تقدس کی چادر سرک نہ جائے؟ — 10
تعلیم و تحقیق

دہلی میں ۱۲۳ اوقاف کا مسئلہ: غلط دروازے پر غلط دستک — 11
قانون واوقاف

اے آئی: اردو کمیونٹی کے لیے ایک تاریخی تناظر اور فوری ضرورت — 13
سائنس و ٹیکنالوجی

دوہرے خطرے میں نادار بچوں کی تعلیم کا دنیا کا سب سے بڑا نظام — 15
تعلیم و تحقیق

طاعون یا افواہ؟ سائبیریا کی ایک موت نے دنیا کو کیوں چونکایا — 16
سائنس و تحقیق

مسلم مجاہدینِ آزادی جن کو یاد رکھنا ہر ہندوستانی پر واجب ہے — 19
تاریخ و تحقیق

مشرقِ وسطیٰ کا بدلتا نقشہ: ہرمز سے باب المندب اور ینبع تک — 23
عالمی منظر نامہ

۱۷۰ کلومیٹر کا خواب: سعودی عرب کے شہرِ مستقبل کو کیا ہوا؟ — 27
عالمی منظر نامہ

عصرِ رواں کے نئے بُت، طوفانِ حوادث اور خوابیدہ ملت — ایک صدائے بیداری — 31
کالم

حضور نظام، حضرت جامعی اور جناب بو علی سینا — 33
فکرِ فردا

اکیسویں صدی کا پانی پت اور مکھیوں کی جنگ — 36
فکرِ فردا

فریدون، ضحاک اور نگمانند — 39
فکرِ فردا

فہرست کا تسلسل

شخصیات، تاریخ اور فکرِ فردا سے منتخب تحریریں۔

SEPTEMBER 2026 / COMPLETED OCTOBER 2026

ہندوستانی مسلمان اور حق تعلیم مستثنیٰ منہ — 42
فکرِ فردا

راہل، انا اور میں — 45
فکرِ فردا

فلسطین کے آنسو اور فلسطینیوں کی مسکراہٹ — 47
فکرِ فردا

سوال صرف مودی کی خودسری کا نہیں، مسئلہ ملک کے آئین و قانون کی بے بسی کا ہے — 50
فکرِ فردا

جنگل کا زمانہ، ہم اور ہمارے حکمراں — 54
فکرِ فردا

اور جب مذہب افیون کی گولی بن جاتا ہے — 57
فکرِ فردا

۔۔۔اور جب برج شاہی بولے گا — 60
فکرِ فردا

چاندپر چاندنی چوک: باباجی، بی جے پی اور کانگریس — 62
فکرِ فردا

باباجی، بی جے پی اور کانگریس — 65
فکرِ فردا

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا؟ دنیائے عرب کا عوامی انقلاب — 68
فکرِ فردا

انا ہزارے، کانگریس اور مسلمان — 71
فکرِ فردا

انا کے پیچھے کون؟ کانگریس نے تاریخ سے سبق نہیں لیا — 74
فکرِ فردا

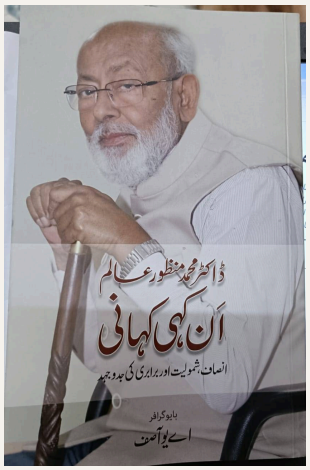
امریکہ اور پاکستان کی کشمکش: افغانستان میں تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے — 76
فکرِ فردا

شخصیات و مطالعہ

ڈاکٹر محمد منظور عالم: ان کہی کہانی

احمد جاوید

2024 / 03 / 18



انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے بانی و سربراہ ڈاکٹر محمد منظور عالم کی کتاب حیات کے یہ اوراق ہم جیسوں کے لیے مشعل راہ بھی ہیں اور درس عبرت بھی۔ یہ سرگذشت یہ بھی بتاتی ہے کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی اور یہ بھی کہ یہ عشق آسان نہیں، آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

کتاب: ڈاکٹر محمد منظور عالم-ان کہی کہانی مرتب: اے یو آصف ضخامت: 424 صفحات قیمت: 750 روپے ناشر: جینوین پبلیکیشنس پرائیویٹ لمیٹیڈ، نئی دہلی

آپ 1950-60 کی دہائی کے شمالی بہار میں نیپال سے نکلتی ندیوں کے پانی سے سیراب ان گاؤوں کا تصور کریں جو پوری طرح کاشتکاری پر منحصر ہیں، اکادکا لوگ چھوٹے موٹے کاروبار، ملازمت یا محنت مزدوری کے لیے شہروں کو جاتے ہیں لیکن ابھی تک اس رجحان کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ اعلیٰ تعلیم کا رجحان بھی مخصوص خاندانوں تک محدود ہے۔ اب ذرا نقشے کو قریب لاکر نیپال کی سرحد (جموئی سنگم) سے صرف 13 میل نیچے آئیں، یہ دریائے کملا سے کوئی 27 میل پچھم اور دریائے باگمتی سے تقریباً اتنے ہی پورب ایک ایسا گاؤں ہے جہاں ابھی تک کسی نے میٹرک نہیں کیا۔ گاؤں میں کوئی پرائمری اسکول بھی نہیں ہے۔ بچوں کو اسکول جانے کے لیے ایک سے دو میل تک چل کر پڑوس کے گاؤوں کو جانا پڑتا ہے۔ اسی گاؤں کے ایک کاشتکار خاندان کے تین بیٹوں میں سب سے چھوٹے نے گاؤں میں پہلی بار میٹرک کیا، پھر اس نے بیچلر بھی کر لیا اور اب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے شانتی نکیتن جانا چاہتا ہے لیکن پڑوس کے گاؤں کے ایک ذی علم و جہاندیدہ بزرگ کے مشورے پر وہ وشو بھارتی کے بجائے علی گڑھ چلا گیا جہاں اس کی شخصیت کی نشوونما ایک ایسے سوشل سائنٹسٹ کے طور پر ہوئی جس نے آگے چل کر ملک و ملت کو اپنی نوعیت کا ایک منفرد تھینک ٹینک دینا اور عالم اسلام کے مختلف ملکوں سے ہندوستان کے دانشورانہ روابط کی ایک مضبوط کڑی بننا تھا۔ آپ ایک ایسے طالب علم کو تصور میں لائیں جس کی دلچسپی ریاضی میں تھی لیکن نہ تو اس کے اسکول میں ریاضی کی تعلیم کا معقول نظم تھا نہ گھر کی معاشی حالت اتنی اچھی تھی کہ پرائیویٹ ٹیوشن لیتا، اس لیے اس نے سماجی علوم کا رخ کیا۔ پری یونیورسٹی میں سیاسیات رکھی لیکن سیاست اور سیاسیات پر کالج کے ایک ٹیچر کے منفی تبصرے سے متاثر ہو کر اس نے اسے چھوڑ دیا۔ اب اس نے معاشیات پڑھی، اسی میں بی اے اور ایم اے کیا۔ شانتی نکیتن جانے کی اس کی خواہش اب بھی زندہ تھی لیکن اساتذہ کے دباؤ نے علی گڑھ چھوڑنے نہیں دیا۔ چلا جاتا تو شاید اس کا چند سال بچ جاتا، ملک پر ایمرجنسی کی افتاد کے باعث اسے مسلم یونیورسٹی میں جو پریشانیاں پیش آئیں، نہیں آتیں اور شاید اس کی زندگی کا رخ کسی اور سمت ہوتا لیکن کون جانتا تھا کہ ان ہی بہ ظاہر ناموافق اتفاقات نے اس پر بیرونی دنیا کے وہ دروازے کھولنے ہیں جو مکہ

ڈاکٹر محمد منظور عالم: ان کہی کہانیہ تسلسل

مکرمہ ، مدینہ منورہ اور معاصر دنیائے اسلام کے مختلف مراکز اور تھینک ٹینکس تک جاتے ہیں۔ آپ ایک ایسے ماہر اقتصادیات کو تصور میں لائیں جو دنیا کے ایک سب سے دولت مند ملک کی وزارتوں میں اہم خدمات انجام دیتا ہے، حکومت کا مشیر اقتصادیات رہ چکا ہے، اس کے اعلیٰ حکام اور وزیروں میں بے حد مقبول ہے، ان کی ایسی قربتیں اسے حاصل ہے کہ برصغیر سے تعلق رکھنے والے احباب وشناسا اس پر رشک کرتے ہیں لیکن کوئی آٹھ سال بعد عین اس وقت جب اس کی عملی زندگی چوٹی پر تھی، اس نے ہندوستان واپس آکر ایک ایسا تجربہ کرنے کا فیصلہ کر لیا جو کوئی معمولی آدمی نہیں کر سکتا تھا۔ ملک و ملت کی خدمت کے جذبہ سے بالکل غیر کاروباری بنیاد پر سیاسی، سماجی اور اقتصادی امور کی علمی تحقیق، تجزیے اور مطالعات کا ادارہ قائم کیا اور پھر خود کو رجحان سازی کے مشاغل اور ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی و سماجی مفادات کی دانشورانہ جدوجہد کے لیے وقف کر دیا۔ آپ ایک ایسے دانشور کو تصور میں لائیں جس نے ایک بڑی کامیاب اور بہت مصروف زندگی جی ہے اور اب وہ اپنی عمر طبعی کے اس حصے میں ہے جب لوگ آرام کرتے ہیں، خیر خواہوں اور معالجوں کی جانب سے آرام کا مشورہ دیا جاتا ہے لیکن وہ 80 کی عمر میں صحت کے سنگین مسائل اور اعصاب شکن عوارض سے دوچار ہونے کے باوجود آرام نہیں کرتا۔ اسے ہر ہفتے دو بار ڈائیلیسس کی اذیت سے گذرنا پڑ رہا ہے لیکن وہ ہر ڈائلیسس کے اگلے دن دفتر آجاتا ہے، انتظامیہ اور عملہ کی میٹنگیں لیتا ہے، پروجیکٹس پر کام کرنے والوں کی رہنمائی کرتا ہے اور ادارے کے ایک ایک کام کی باریکیوں پر نظر رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ گھر بیٹھ جائے تو کام رک جائے۔ ادارے کو اہل کارکنان اور تجربہ کار منتظمین کی خدمات حاصل ہیں، اسکالرس کی ایک اچھی خاصی ٹیم کا تعاون بھی ہے، قابل اعتماد معاونین ،سعادت مند فرزند اور اہل جانشین بھی ہیں۔ کسی ادارے کو معمول پر رکھنے کے لیے جو کچھ درکار ہے، وہ سارے لوازمات موجود و فعال ہیں لیکن وہ ہے کہ آرام سے نہیں بیٹھتا، ملک و ملت کی فکر اسے بے چین رکھتی ہے لیکن اس کے چہرے کا اطمینان ظاہر کرتا ہے کہ مایوسی اسے چھو کر نہیں گذری۔ یہ کوئی اور نہیں، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے بانی و سربراہ ڈاکٹر محمد منظور عالم ہیں جن کی کتاب حیات کے یہ اوراق ہم جیسوں کے لیے مشعل راہ بھی ہیں اور درس عبرت بھی ۔ ہم عموماً بہت جلد ہمت ہار دیتے ہیں، آسانیاں ہمیں بہت زیادہ خوش اور پر عزم کر دیتی ہیں اور مشکلات اتنی ہی جلد مایوس و مضمحل۔ ہم سوچتے بھی ہیں اور منصوبے بھی بناتے ہیں لیکن ان کو عمل میں اتارنے کے لیے جس قوت ارادی، جیسی محنت اور جیسے عمل پیہم کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی کمی ہمارے قدموں کی زنجیر بن جاتی ہے لیکن آپ دنیا کی تاریخ کا جائزہ لیں، مختلف النوع معاشروں اور قوموں کی زندگیوں میں جھانک آئیں، پورب پچھم سب چھان لیں، کسی منظور عالم کی زندگی ان خوبیوں سے خالی نہیں ہوتی۔ کوئی جلد باز، جلدی خوش اور جلدی مایوس ہو جانے والا یا محض خواب دیکھنے اور منصوبے بنانے والا ، مضبوط قوت ارادی سے خالی، صبر واستقامت سے دور اور محنت سے جی چرانے والا کبھی کچھ ایسا نہیں کر سکا جو کسی قوم یا معاشرے پر اثر انداز ہوتا۔ اس وقت ڈاکٹر محمد منظور عالم کی کتاب زندگی ''ان کہی کہانی'' ہمارے سامنے ہے جو معروف صحافی اے یو آصف نے ترتیب دی ہے۔ یہ کتاب آپ کو ان خوابوں سے بھی روبرو کراتی ہے جس نے ان کی زندگی کی سمت و رفتار پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے بلکہ اس کے رخ کا تعین کیا، ان لوگوں سے بھی ملاقات کراتی ہے جو اس کہانی میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں، ان اتفاقات کو بھی سامنے لاتی ہے جو بتاتے ہیں کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی اور ان مشکلات و مراحل سے بھی پردے اٹھاتی ہے جو بتاتی ہے کہ یہ عشق آسان نہیں ہے، آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ لیکن سوا چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب صحیح معنوں میں ابھی ''ان کہی کہانی'' ہے۔ قدم قدم پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ اس میں یہ تو مذکور پاتے ہیں کہ پروفیسر نجات اللہ صدیقی اور پروفیسر فضل الرحمٰن فریدی نے موصوف کی فکر اور شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا لیکن کہانی اس کی جزئیات و تفصیلات میں نہیں جاتی، اسی طرح یہ ڈاکٹر احمد توتونجی، امام کعبہ قاضی شیخ سعید الجندل، شیخ

ڈاکٹر محمد منظور عالم: ان کہی کہانیہ تسلسل

سعید بن سعد، عبدالحمید بن سلیمان، ڈاکٹر طہ جابر العلوانی، ڈاکٹر ہشام الطالب، جمال برزنجی، ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی، ڈاکٹر حسن ترابی اور ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف جیسے عرب دانشوران و مفکرین سے آپ کی ملاقات کراتی ہے اور ملیشیا کے انور ابراہیم سے بھی لیکن اس گہرائی تک نہیں لے جاتی جہاں تک ایک اوسط ذہن پہنچنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر محمد منظور عالم کی سرگذشت کے یہ اوراق جہاں یہ بتاتے ہیں کہ ان کی زندگی میں سادگی، اعتدال اور توازن کو کتنی اہمیت حاصل ہے وہیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیت کے تعلق سے کتنے محتاط ہیں۔ کتاب میں از اول تا آخر ٹھوس واقعات سے کام لیا گیا ہے، تبصرے بہت کم ہیں، اس قبیل کے جو مواد آئے ہیں وہ اہم شخصیات، معاصرین اور رفقائے کار کے تاثرات و اعترافات تک محدود ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک عہد کی تاریخ ہیں۔ ''ڈاکٹر منظور عالم: ان کہی کہانی'' کے مرتب اور طابع و ناشر نے ان کے مختصر پروفائل، ضروری تصاویر اور سوا چار سو میں سے ڈھائی سو سے زائد صفحات پر پھیلے ہوئے متعلقہ دستاویزات کو محفوظ کر کے تاریخ کے طالب علموں پر ایک گرانقدر احسان کیا ہے لیکن کاش! یہ ایک ایسی خود نوشت سوانح ہوتی جو ان کے تجربات و مشاہدات کے ساتھ واقعات و شخصیات پر ان کی رائے کو بھی سامنے لاتی۔ کتاب کیا ہے، ہم جیسوں کے لیے ایک جہان دیدہ کی سیر لیکن یہ ہماری تشنگی دور نہیں کرتی، بڑھا دیتی ہے۔ کہانی ابھی ان کہی کی ان کہی ہے۔

اسی تحریر سے

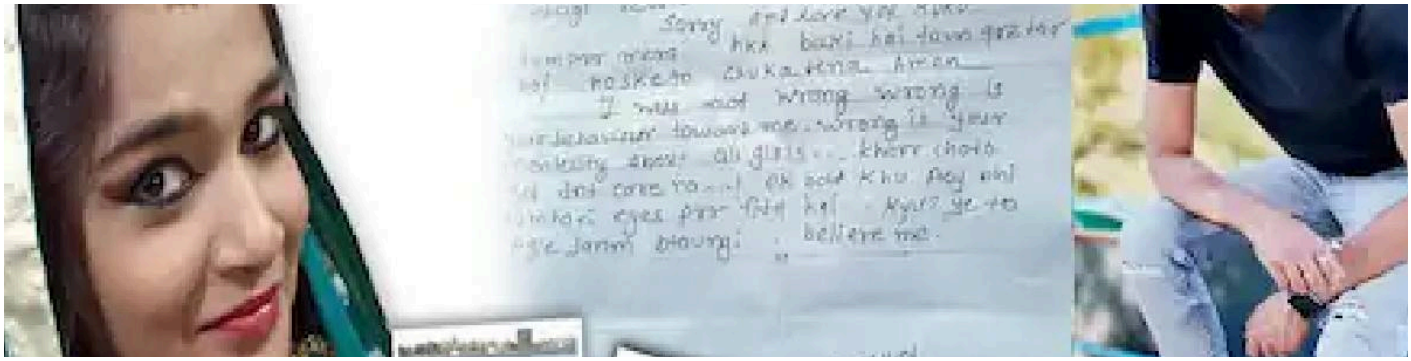
یہ سرگذشت یہ بھی بتاتی ہے کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی اور یہ بھی کہ یہ عشق آسان نہیں، آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

معاشرہ

ایک موت کی انگنت چیخیں اور اس کا ان سنا سچ

ثقافت ثقافت

2023 / 04 / 15



مضمون کی ویب اشاعت سے

راجستھان کے جالور سے تعلق رکھنے والے، احمد آباد کے باشندہ لیاقت مکرانی اور حرمت بی بی کی ۲۳ سال کی خوبصورت اور تعلیم یافتہ بیٹی عائشہ خان نے گزشتہ جمعہ (۲۶ فروری) کو سابرمتی ندی میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔ وہ اپنے شوہر اور اس کے اہل خانہ کے سلوک سے پریشان تھی۔ اس نے ایسا کرنے سے پہلے اپنے شوہر عاف خاں سے فون پر کوئی ۷۰ منٹ تک بات کی تھی اور اس گفتگو کو ریکارڈ کیا تھا، پھر اپنی خودکشی پر ویڈیو بنا کر اپنا بیان محفوظ کیا اور موت کو گلے لگا لیا۔ سابرمتی کی موجوں میں اس کی چھلانگ سے پیدا ہونے والے چھپاکے اور اس کی اس اندوہناک موت پر لوگوں کی چیخیں ہیں کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی ہیں لیکن شاید اس سچ کو کسی نے نہیں سنا جو اس خودکشی کے پیچھے موجود ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں یہاں اس کی زحمت شاید ہی کوئی کرے۔ کون سنتا ہے نقار خانے میں طوطی کی آواز؟

عائشہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی، اسے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا، وہ ابھی تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن والدین اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے، ابھی وہ بیس سال کی بھی نہیں تھی کہ اس کی شادی کردی گئی اور شادی کے بعد اس کو تعلیم چھوڑنا پڑی۔ اس نے میں اگست میں اپنے شوہر اور اس کے خاندان پر جہیز کے لیے ہراساں کرنے کا مقدمہ کیا تھا۔ اب اس نے مرنے سے پہلے جو ویڈیو شوٹ کیا ہے، اس میں کہہ رہی ہے ”اگر وہ مجھ سے آزادی چاہتا ہے تو اسے آزادی ملنی چاہیے۔ میری زندگی اب یہیں تک ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اللہ سے ملوں گی۔ میں اس سے پوچھوں گی کہ میں کہاں غلط تھی؟ مجھے اچھے والدین ملے، اچھے دوست ملے، ہو سکتا ہے کہ میرے مقدر میں کوئی خرابی ہے۔ میں خوش ہوں۔ میں اطمینان سے الوداع کہہ رہی ہوں۔ میں اللہ سے دعا کروں گی کہ مجھے دوبارہ کبھی بھی انسانوں کا چہرہ نہ دیکھنا پڑے‘۔ یہ عائشہ کے آخری الفاظ ہیں جس میں موجود درد کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ کتنی مایوس اور کتنے غصے میں تھی۔ اسے اپنے خاندان اور سماج سے ہی نہیں اپنی تقدیر اور اپنے خالق سے بھی شکایت ہے کہ اس نے اسے کیوں پیدا کیا اور وہ انسانوں کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ عائشہ کے یہ الفاظ ایک عائشہ کی ہی نہیں آج کے عام نوجوانوں کی نفسیات کا اشتہار اور ان کی ذہنی حالت کا آئینہ ہیں۔ آج اس ملک میں کم و بیش ہر نوجوان کو اپنے آپ سے، اپنے گرد و پیش، خاندان، سماج اور تقدیر سے یہی شکایت ہے اور اگر وہ لڑکی ہے تو اس کی نفسیاتی کیفیت کی شدت کیا ہوتی ہے، وہ کوئی بھی حساس انسان سمجھ سکتا ہے۔ عائشہ نے سابرمتی ندی میں کودنے سے پہلے یہ بھی کہا ’میں دعا کرتی ہوں کہ یہ خوبصورت دریا مجھے اپنے گلے لگا لے‘۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کو زندگی سے زیادہ خوبصورت موت کب لگنے لگتی ہے۔

ایک موت کی انگنت چیخیں اور اس کا ان سنا سچ تسلسل

عائشہ نے ۲۵ فروری کو اپنے شوہر عارف خان سے ۷۰ منٹ کی گفتگو ریکارڈ کی تھی اور اس گفتگو کے دوران اس کے شوہر نے اس سے کہا تھا: 'میں تمہیں لینے نہیں آؤں گا، تمہیں مر ہی جانا چاہیے اور اس کی ویڈیو بنا کر بھیجنا تبھی مجھے یقین آئے گا کہ تم مر چکی ہو'۔ یہ کوئی عام میاں بیوی کی نہیں، ایک عاشق جوڑے کا مکالمہ ہے، عائشہ کو شکایت ہے کہ اس کا پیار یک طرفہ ہے، اس کا باپ اسے یاد دلاتا ہے کہ اس کا نام کتنا خوبصورت ہے، ماں عائشہ کی عظمت و تقدس کا واسطہ دیتا ہے، بیٹی سے زندگی کی بھیک مانگتا مگر اس خوبصورت لڑکی کو شکایت ہے کہ وہ اپنے نام جیسی خوبصورت تقدیر لے کے پیدا نہیں ہوئی۔

عائشہ کی خودکشی کا کلائمکس دیکھ کر مشہور فرانسیسی ادیب موپاساں کی اس کہانی کے مناظر میری آنکھوں میں پھر گئے جس میں اس نے آرٹسٹوں کے معاشقے، معاشقے کی شادیاں اور رومانس کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے، اس نے بتایا ہے کہ زندگی رومان نہیں، بڑی تلخ حقیقت ہے۔ رومان اور معاشقے کی عمر کوئی دو ڈھائی سال ہوتی ہے۔ پھر توقعات ٹوٹنے لگتے ہیں اور ایسے جوڑے اکثر اس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ موپاساں کی کہانی کا ہیرو جب جان چھڑا کر کہیں چلا جاتا ہے تو اس کی محبوبہ (جو اب بیوی ہے) اس کو ڈھونڈتے ہوئے ایک دن اس کے ٹھکانے پر پہنچ جاتی ہے۔ مکان کی پہلی منزل پر وہ کرایہ کے اس گھر میں اپنے عاشق سے کہتی ہے اگر تم نے نہیں مانا تو میں ابھی یہیں سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لوں گی اور اس کا شوہر اس کی اس دھمکی کے دباؤ میں آنے یا اس کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے خاص ادا سے اپنی کرسی سے اٹھتا ہے، کمرے کی کھڑکی کھولتا ہے اور ہاتھوں کے اشارے سے کہتا ہے تو دیر کس بات کی ہے۔ خاتون ایک لمحے کو سوچتی ہے، ذرا ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھتی ہے اور پھر تیر کی رفتار سے پلک جھپکتے میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ چونکہ اس نے زیادہ اونچائی سے چھلانگ نہیں لگائی تھی، اس لیے وہ صرف اپنے پیر گنوا دیتی ہے، اس کی جان بچ جاتی ہے اور اب یہ جوڑا ساتھ ساتھ جی رہا ہے، وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہیں مگر موپاساں کی کہانی کا مرد اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس کی محبوبہ نے عشق میں ایسا کیا کہ یہ اس کی خود غرضی تھی یا وہ اپنی زخم خوردہ انا کی تسکین کے لیے جان سے کھیل گئی؟ کاش! عائشہ زندہ ہوتی اور عارف کے پاس بھی موپاساں کی کہانی کے کردار کی طرح اس کو اپنانے کا وقت ہوتا۔ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ خودکشی بزدلی بھی ہے اور ایک بھیانک ترین انتقام بھی جو کوئی شخص اپنے چاہنے والوں سے لیتا ہے۔

اس موت کا ایک دوسرا پہلو بلکہ ان سنا سچ اور بھی ہے اور وہ ہے اس ملک میں بیٹیوں کی سماجی حالت۔ بیٹیاں ہمارے سماج میں پرایا دھن ہوتی ہیں اور وہ زندگی بھر منگل سوتر، سہاگ اور سندور کی نفسیات میں مبتلا رہتی ہیں۔ کسی قیمت پر اس کو گنوانا نہیں چاہتیں اور اس کو گنوا کر جینا ان کے لیے موت سے بھی بدتر ہے۔ شوہر سے علاحدگی یا طلاق کا تصور نہیں کر سکتیں۔ لعنت تو یہ ہے کہ اس ملک کا مسلم معاشرہ بھی اسی نفسیات میں مبتلا ہے اور مسلم عورتیں بھی اس کا عذاب جھیلنے کو مجبور ہیں۔ عائشہ یا تو اپنے شوہر عارف سے بے پناہ محبت کرتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے اس کے میکے سے لینے آئے اور وہ اسے معاف کر دے لیکن عارف نے ایسا نہیں کیا، اس کے بجائے اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ اس سے اس کی بے وفائی کا انتقام لینا چاہتی تھی یا پھر وہ طلاق کے تصور سے خوفزدہ تھی۔ ہم نے اگر عائشہ کی موت کی چیخیں سنی ہیں اور سچ مچ انسانیت سے ہمیں کوئی پیار ہے تو آج ہی منگل سوتر، سہاگ، سیندور اور کنیادان کی اس نفسیات کے خلاف جہاد چھیڑنا چاہیے جس کے عذاب میں مبتلا عورتیں یا تو زندہ رہ کر ہر لمحہ مرتی ہیں، ہر دن موت کی اذیت سے گزرتی ہیں یا پھر خودکشی کر لیتی ہیں۔ کاش! ہم عائشہ کی کہانی کے اس ان سنے سچ کو سنتے۔ (جاری)

تعلیم و تحقیق

دینی مدارس کا نصاب و معیار: تقدس کی چادر سرک نہ جائے؟

ثقافت

2023 / 04 / 15

ملک کے سب سے بڑے دینی مدارس و مسلکی مراکز میں سے ایک میں باریابی کا اتفاق ہوا۔ مدرسہ اپنے نام کے ساتھ جامعہ لکھتا ہے، مقامی لوگ اس کو یونیورسٹی پکارتے ہیں۔ اس کے بانیوں نے ۷۰ کے عشرے میں اس تاریخی مدرسے کی توسیع کے وقت بار بار اس کو عربی یونیورسٹی بنانے کا اعلان کیا تھا اور اس پر لوگوں کے جوش و خروش کا عالم یہ تھا کہ صرف ڈیڑھ سال میں اس کی وسیع و عریض عالیشان عمارت بن کر تیار ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن سے جو خیر سے ایک گورنمنٹ کالج کے پرنسپل رہ چکے تھے اور میری بات سمجھ سکتے تھے، سوال کیا کہ بانیان جامعہ کے خوابوں کی عربی یونیورسٹی آج تک مدرسہ کا مدرسہ ہی کیوں ہے، آپ کے پاس معقول اراضی، اور انفراسٹکچر وغیرہ موجود ہے اور اب جبکہ پرائیویٹ یونیورسٹی آسانی سے منظور کرائی جاسکتی ہے تو آپ جامعہ کو سچ مچ کی جامعہ کیوں نہیں بنا لیتے۔ ایک سے زائد انٹر کالج تو آپ کے پاس پہلے ہی موجود ہیں۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے ”ابھی ناظم صاحب سے ہماری ملاقات ہو گی۔ ان کے سامنے اپنی بات رکھیے“۔ ملاقات کے دوران ناظم صاحب سے بات کی تو ان کا یہ جواب سن کر میرا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا کہ ”ہم جامعہ کو سرکار کو دینا نہیں چاہتے“۔ یہ اس ناظم کا جواب تھا جس کے دستخط سے اتر پردیش مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے اس مدرسہ میں اساتذہ کی تقرری ہوتی ہے اور اساتذہ حکومت سے ہر ماہ تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ناظم صاحب ایک سینٹرل یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اور پیشہ سے انجینئر ہیں۔ میں اب ان سے کیا کہہ سکتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔ پھر بھی حوصلہ جٹا کر عرض کیا کہ یونیورسٹی بنا لینے سے تو آپ اس سے کہیں زیادہ آزاد و خود مختار ہوں گے جتنے آج ہیں۔ میں نے آپ کو سرکار یا کسی کو اپنا ادارہ دینے کا مشورہ کب دیا ہے۔ ان کی شوریٰ کے رکن موصوف و مرحوم نے بھی بات کو کچھ سنبھالنے کی کوشش کی۔ اب ناظم صاحب نے اپنے دفتر کے ایک کلرک کو چائے کی میز پر بلوایا جو کچھ زیادہ جہاندیدہ سا لگ رہا تھا، ہم نے اب اور تفصیل سے بتایا کہ کس طرح اس ادارے کو سچ مچ ایک عربی یونیورسٹی بنایا جاسکتا ہے۔ ملک کی ایک مشہور غیر سرکاری یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا نام لے کر بتایا کہ وہ اس کارروائی میں آپ کی مدد اور رہنمائی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ تاثر دیا کہ وہ سمجھ گئے ہیں اور ان کو یہ تجویز اچھی لگی ہے۔ ناظم صاحب موصوف نے یہ بھی کہا کہ وہ جلد ہی حضرت سربراہ اعلیٰ کی خدمت میں تجویز رکھیں گے اور شوریٰ کی آئندہ میٹنگ میں اس پر غور کیا جائے گا۔ اب دو سال ہونے کو آئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس مسئلے میں سنجیدہ بھی تھے یا نہیں اور انہوں نے کوئی پیش قدمی بھی کی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دیوبند اور ندوہ کے ذمہ داروں سے بھی بات کرتا تو کم و بیش یہی جواب ملتا اور اسی طرح کی خاموشی پیش آتی۔ حالانکہ یہ وہ ادارے ہیں جو جب چاہیں یونیورسٹی اور ڈیمڈ ٹو بی یونیورسٹی بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان پر دولت لٹانے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن ان کے ذمہ داروں میں خوف ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں تقدس کی وہ چادر سرک نہ جائے جس کی سفیدی پر اپنے پرائے فدا ہیں۔

قانون واو قاف

دہلی میں ۱۲۳ اوقاف کا مسئلہ: غلط دروازے پر غلط دستک



احمد جاوید

2023 / 04 / 15



مضمون کی ویب اشاعت سے

ہندوستان میں قوانین بنیادی طور پر دو نوعیت کے ہیں، فوجداری (تعزیری) اور غیر فوجداری (منصفی) یعنی کرمنل لا اور سول جسٹس. پھر ان دونوں کے ضابطہ جاتی قوانین الگ ہیں جو عدالتوں اور تفتیشی ایجنسیوں کی کارروائیوں کے طور طریقے کو طے کرتے ہیں. ان دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلے قسم کے مقدمات میں قانون اور عدالت از خود کارروائی کرتی ہے. مدعی اور گواہوں کے بیان کی تحقیق و تحکیم اور اس کی بنیاد پر فریق استغاثہ کی مدد کرنا اور مجرم کو سزا دینا دلانا عدالت کی ذمہ داری ہے، ریاست اس میں مدعی کے ساتھ فریق استغاثہ ہوتی ہے. سول جسٹس کے مقدمات میں ایسا نہیں ہوتا. اس میں مدعی (فریق اول) کو دعوے اور تنقیحات خود پیش کرنا ہوتا ہے، عدالت آپ کے دعووں اور ثبوتوں کی جانچ جانچ کر کے صرف یہ طے کرتی ہے کہ آپ نے جو حقوق یا راحت طلب کی ہے، وہ جائز ہے یا نہیں. آپ نے اگر مقدمے کی نوعیت کو نظر میں رکھے بغیر غلط دروازے پر غلط دستک دی تو نتیجہ غلط نکلے گا، عدالت یا سرکاری ایجنسیاں آپ کی کوئی مدد نہیں کرینگی.

دہلی میں اوقاف کی 123 اراضی کا مسئلہ جو برسہا برس سے زیر بحث ہے، ایسا ہی ایک مسئلہ ہے جو سول جسٹس کے مقدمہ کو فوجداری کی طرح لینے اور غلط دروازے پر غلط دستک دینے سے پیدا ہوا اور چل رہا ہے.

اس مسئلے میں یہ تین نکات یاد رکھنے کے ہیں. (1) یہ ساری کی ساری 123 جائیدادیں اہل اسلام کی ہیں، ان کے قبضے اور استعمال میں ہیں. بالکل غیر متنازعہ ہیں. ایسا اس وقت بھی تھا جب برنی کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ان کا کنٹرول دہلی وقف بورڈ کو دے دیا جائے کیونکہ ان کے خرد برد ہونے کا خطرہ تھا یا ان میں سے بعض کے بعض حصوں پر مقبوضات قائم کر لی گئی تھیں. ان ہی میں جامع مسجد دہلی اور اس طرح کی کئی بڑی مساجد بھی شامل ہیں.

(2) ان پر تنازعہ اس وقت پیدا ہوا جب وقف بورڈ نے سرکار کے ساتھ لیز کیا یعنی اس کی ملکیت ایک معینہ مدت کے لئے بورڈ کو منتقل کی گئی. گویا کہ وقف بورڈ نے باضابطہ تحریری طور پر تسلیم کر لیا کہ یہ جائیدادیں کسی محکمہ مجاز کی ملکیت ہیں. یہ ایک غیر قانونی کارروائی تھی کیونکہ یہ جائیدادیں وقف عام ہیں اور صدیوں سے اہل اسلام کے قبضہ و تصرف میں ہیں اور اس پر کسی کا کوئی مالکانہ حق نہیں تھا، محکمہ مجاز کے کاغذات میں ایسی جائیداد کی ملکیت کے خانے میں اس لیے سرکار/ ریاست درج ہوتا ہے کیونکہ یہ کسی فرد/افراد کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی اور یہ محصولات اراضی سے مستثنیٰ ہوتی ہے. یہ جائیداد مجاز و متعلقہ کمیونٹی کی ہوتی ہے جس کی تفصیلات کھتیان کے ساتویں خانے میں درج ہوتی ہیں لیکن وہ بھی اس کے استعمال کی مجاز ہوتی ہیں اس میں تصرف کی مجاز نہیں ہوتی، حکومت کی نگرانی

دہلی میں ۱۲۳ اوقاف کا مسئلہ : غلط دروازے پر غلط دستک تسلسل

میں ہوتی ہے گویا اس کے حقوق ملکیت واستعمال ریاست اور متعلقہ کمیونٹی کے درمیان مشترک ہوتے ہیں. کمیونٹی کے پاس اس کے استعمال کا حق ہے اور ریاست کے پاس اس کی حفاظت کی ذمہ داری کہ اس کا استعمال تبدیل نہ کیا جائے. غرضیکہ سارا معاملہ کمیونٹی اور ریاست کے درمیان ہے جس کو وقف بورڈ اور سرکار/ محکمہ کے بیچ بنایا گیا. جبکہ بورڈ کسی وقف کا مالک نہیں ہوتا، صرف اس کا نگران اور انتظام کار ہوتا ہے. وہ وقف جائیدادوں کی بہ شرط ضرورت و حسب منشا واقف لیز کرتا ہے، وقف جائیداد کی لیز نہیں لیتا، وہ اوقاف کا قانونی نگراں و منتظم ہے. یہی لیز وہ غلط دستک تھی جس نے اس مسئلہ میں تیسرے فریق کے لیے دروازہ کھولا اور فرقہ پرست ہندو گروپ اس میں داخل ہوا کہ جو زمین سرکار وقف بورڈ کو دے رہی ہے وہ ہمیں کیوں نہیں دے سکتی جبکہ ہم زیادہ قیمت پر لیز حاصل کرنا چاہتے ہیں. اب عدالت اس لیز کو برقرار رکھتی ہے تو ایک خطرناک پنڈارہ باکس کھلتا ہے لیکن وقف بورڈ اور مسلم لیڈران اسی اندھی لکیر کو پیٹ رہے ہیں.

برنی کمیٹی اور لیز کا کھیل جامع مسجد جیسی مساجد سے اہل محلہ اور امام کا کنٹرول ختم کرکے ان پر وقف بورڈ/ سرکار کو قابض و دخیل کرنا تھا جس سے یہ تنازعہ پیدا ہوا.

(3) اسی الجھن کو دور کرنے کیلئے نیا وقف ایکٹ لایا گیا جس میں وقف جائیداد کی تعریف تبدیل کی گئی اور اس کی رو سے وقف بورڈ کو اختیار دیا گیا کہ وقف کی حفاظت اور رکھ رکھاؤ کے لیے ایسی جائیدادوں کا از خود اندراج کرکے جس کا کوئی باضابطہ شرعی متولی نہیں یا جہاں متولی نااہل ہو چکا ہے، اسے اپنے کنٹرول میں لے یا اس حفاظت کی غرض سے بورڈ کو وہ اختیارات دیے گئے جو پہلے اسے نہیں حاصل تھے. اس پر کسی کا قبضہ ہے تو خالی خود کرا سکتا ہے اور حکومت وانتظامیہ اس کارروائی میں اس کی مدد کرنے کی پابند ہے. اعتراض کی صورت میں اس پر ضابطہ فوجداری وغیرہ کے عام قوانین اور عام عدالت کے بجائے مقدمہ کی سماعت وقف ٹریبونل میں ہوگی اور دعویدار کو حق ملکیت کا ثبوت پیش کرنا ہوگا. جو لوگ ہائیکورٹ میں 123 جائیدادوں کی ملکیت کا مسئلہ لے گئے یا سرکار نے جو لیز کیا انہوں نے ایک غلط دروازے پر غلط دستک دے کر مسئلہ پیدا کرنے کا ارتکاب کیا اور اب بھی اسی غلطی کو دوہرا رہے ہیں. لیز بھی غیر قانونی ہے اور ان پر بشمول وقف بورڈ کسی کی ملکیت کا دعویٰ بھی ناقابل سماعت اور کالعدم ہے. بورڈ ان جائیدادوں کا نگران محض ہے، ملکیت ریاست اور کمیونٹی کے درمیان مشترک ہے. کھتیان کے ساتویں خانے میں جن کا نام درج ہے ان کو حکومت یا کوئی اور کسی بھی حال میں اور کسی قیمت پر بے دخل نہیں کر سکتا. ویسے تو اس ملک میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون صدیوں سے رائج ہے.



سائنس و ٹیکنالوجی

اے آئی: اردو کمیونٹی کے لیے ایک تاریخی تناظر اور فوری ضرورت



طارق عبداللہ

2024 / 03 / 06

تکنیکی ترقی کے ابھرتے ہوئے منظر نامے میں ذہنوں میں خدشات جنم لے رہے ہیں کہ مصنوعی ذہانت (اے آئی) انسانی دنیا پر مکمل قبضہ نہ کر لے۔ تاہم، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس طرح کے خدشات نئے نہیں ہیں اور انسانیت مسلسل تکنیکی تبدیلیوں سے گزرتی رہی ہے۔ ہم اے آئی انقلاب کے دہانے پر کھڑے ہیں اور تاریخ سے سبق لیتے ہوئے اس کی صلاحیت کو اپنانا ناگزیر ہے۔

تاریخ میں پہلے بھی کئی بار مختلف تکنیکی ایجادات نے لوگوں میں خوف پیدا کیا ہے۔ مثال کے طور پر صنعتی انقلاب نے عام لوگوں کے روزگار کے ختم ہو جانے اور سماجی بدحالی کے خدشات کو جنم دیا۔ اسی طرح انٹرنیٹ کی آمد نے معلومات کے بوجھ اور رازداری کے خاتمے کے خدشات کو جنم دیا۔ پھر بھی انسانیت نے موافقت اختیار کی، منفی اثرات کو کم کرنے اور ان تکنیکوں سے فائدہ اٹھانے کے راستے تلاش کیے۔

(ChatGPT) چیٹ جی پی ٹی سے ملیں۔

یہ ایک چیٹ بوٹ پر مبنی ایک اے آئی ٹول (اوزار) ہے لیکن ذہانت سے لیس ہے جسے 30 نومبر 2022 کو لانچ کیا گیا تھا۔

چیٹ جی پی ٹی کو ایک بہت ہی ہوشیار روبوٹ دوست تصور کریں جسے بات کرنا پسند ہے اور وہ آپ کی باتوں کو سمجھ سکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے آپ اپنے دوستوں یا خاندان والوں سے بات کرتے ہیں۔ جب آپ چیٹ جی ٹی پی سے کوئی سوال پوچھتے ہیں یا کچھ کہتے ہیں، یہ آپ کو غور سے سنتا ہے اور سوچتا ہے۔ یہ ایک جادوئی دوست کی طرح ہے جو آپ سے کسی بھی چیز کے بارے میں بات کر سکتا ہے جو آپ چاہتے ہیں، چاہے وہ کہانیاں سنانا ہو، سوالات کے جوابات دینا ہو، یا صرف آپ کے دن کے بارے میں بات کرنا ہو۔

آپ اس سے جتنا زیادہ بات کرتے ہیں، یہ اتنا ہی بہتر ہوتا جاتا ہے کیونکہ یہ آپ جیسے لوگوں کے ساتھ ہونے والی بات چیت سے سیکھتا ہے۔ لہذا یہ انتہائی دوست اور ہوشیار روبوٹ رفیق کی طرح ہے جو آپ کے ساتھ بات کرنے کے لیے جب بھی آپ چاہیں ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ آپ اس کو بہت ساری کتابوں سے بھری ایک بڑی لائبریری تصور کریں لیکن کہانیوں کے بجائے یہ کتابیں گفتگو اور مکالموں سے بھری ہوئی ہو۔ جب آپ اس سے کوئی سوال پوچھتے ہیں یا اس سے

اے آئی: اردو کمیونٹی کے لیے ایک تاریخی تناظر اور فوری ضرورت تسلسل

کچھ کہتے ہیں، تو یہ ان تمام کتابوں سے ملتی جلتی گفتگو کو تلاش کرتا ہے جس سے اسے یہ سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ ایک بہت ہی ہوشیار لائبریرین کی طرح ہے جو۔ آپ کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کے لیے بہترین کتاب تلاش کر سکتا ہو

کیسے کام کرتا ہے چیٹ جی پی ٹی

ان پٹ پروسیسنگ: یوزر کے ان پٹ کے تجزیہ کے لیے ٹوکن میں تقسیم کرتا ہے۔

سیاق و سباق کی تفہیم: جوابات پیدا کرنے کے لیے پچھلی بات چیت کا تجزیہ کرتا ہے۔

پیرامیٹر ٹیوننگ: ترتیب کے دوران پیرامیٹرز کو درست کرتا ہے۔

ٹیکنالوجی سے ڈرنا چھوڑیں

ابھی ہم اے آئی کے انقلاب کا مقابلہ کر رہے ہیں، اردو دان طبقہ تاریخ کے ایک اہم موڑ پر کھڑا ہے۔ اے آئی ٹیکنالوجیز کو اپنانا ترقی اور بے شمار مواقع فراہم کر سکتا ہے۔ اپنے ثقافتی ورثے اور کاروباری اہداف کے ساتھ اردو برادری کو بدلتے ہوئے تکنیکی منظر نامے کے مطابق ڈھلنے میں جلدی کرنی چاہیے۔ اے آئی ٹولز اور پلیٹ فارمز کا فائدہ اٹھا کر اردو داں طبقہ جدیدیت، خوشحالی اور سماجی و معاشی ترقی کی نئی راہیں کھول سکتا ہے۔ اے آئی میں حالیہ پیش قدمیوں نے صحت اور مالیات سے لے کر نقل و حمل اور تعلیم کے مختلف شعبوں تک تبدیلی لانے کی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ تاہم، یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ یہ اپنے چیلنجز اور حدود سے آزاد نہیں ہے۔

مثال کے طور پر اے آئی الگورتھم نے کئی مرتبہ تعصب کا مظاہرہ بھی کیا ہے اور غلط فیصلے کرنے کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں اس لئے ذمہ دارانہ ترقی اور اخلاقی نگرانی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

بلاشبہ مصنوعی ذہانت (اے آئی) انسانی صلاحیتوں کو بڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس میں عالمی تسلط حاصل کے لیے مطلوب ضروری شعور اور ارادے کی کمی ہے۔ خوف کے آگے جھکنے کے بجائے ہمیں اے آئی کی صلاحیت کو بروئے کار لانے پر توجہ دینی چاہیے اور دنیا پر قبضہ ہو جانے کے خوف کو خارج کر دینا چاہیے۔

اے آئی کے دنیا پر قبضہ کر لینے کا خوف تاریخی نظیروں کی بنا پر ہے۔ تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ عملیت پسندی اور رجائیت پسندی کے احساس کے ساتھ اس نئی ٹکنالوجی کو گلے لگا کر ہم جدت کے حامل مستقبل کی طرف راستہ بنا سکتے ہیں۔

نوٹ: اس مضمون کی تصویر اے آئی سے بنائی گی ہے اور اس مضمون کو لکھنے میں بھی اے آئی کا استعمال کیا گیا ہے

اسی تحریر سے

ابھی ہم اے آئی کے انقلاب کا مقابلہ کر رہے ہیں، اردو دان طبقہ تاریخ کے ایک اہم موڑ پر کھڑا ہے۔

تعلیم و تحقیق

دوہرے خطرے میں نادار بچوں کی تعلیم کا دنیا کا سب سے بڑا نظام

ثقافت

2023 / 04 / 15



مضمون کی ویب اشاعت سے

ہندوستان کے دینی مدارس دنیا کا ایک ایسا سب سے بڑا غیر سرکاری نظام (این جی او/نیٹ ورک) ہیں جو عام لوگوں کے تعاون سے، عام لوگوں کے ذریعے اور عام لوگوں کے لیے چلایا جاتا ہے. اس کے منتظمین کوئی امرا اور رؤسا اور خواص نہیں ہوتے۔ ان کی اکثریت بہت کم پڑھے لکھے غریب علمائے دین کی ہے. یہ سماج کے نادار بچوں کی مفت تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی کفالت بھی کرتا ہے۔ اگر یہ مدارس نہ ہوں تو ملت کے لاکھوں بچے ناخواندہ رہ جائیں اور افلاس و تنگ دستی کے جہنم میں جینے کے تباہ کن چکر (vicious sycle) سے وہ اور ان کی نسلیں کبھی نہ نکل سکیں۔ یہ دنیا کا واحد ادارہ ہے جو مفلس و نادار بچوں کو سماج کی سب سے پچھلی صف سے اٹھا کر پہلی صف میں بلکہ قیادت و امامت کے مقام پر پہنچا دیتا ہے مگر آج اس ملک کے بہت کم لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و قیمت کا احساس ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ ان مدارس کو اندرونی اور بیرونی دونوں محاذ پر سنگین خطرات درپیش ہیں جن سے ان کی حفاظت نہ کی گئی تو ملک و ملت کو دین اور دنیا دونوں کے ناقابل تلافی نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

حق تعلیم ایکٹ اور نئی قومی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں ملک کے ان مدارس کے سامنے اب کوئی چارہ ہے تو یہ ہے کہ یہ اپنی درسگاہوں میں

(۱) دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کے مروجہ مسلمہ معیار اور تسلیم شدہ نصاب کی درس و تدریس (UEE) کا نظم کریں

(۲) جو مدارس منظور شدہ نہیں ہیں، ان کو حق تعلیم ایکٹ کی صراحت کے بموجب معیار و شرایط کے ساتھ ریاست کے مجاز محکمہ سے تعلیمی ادارے کے طور پر منظور کرائیں اور

(۳) پانچویں، آٹھویں، دسویں اور بارہویں کے امتحانات کرائیں اور اسناد جاری کریں۔ جو لوگ اوپن اسکولنگ یا کسی اور طریقہ سے مدارس کے بچوں کو دسویں پاس کرانے کی بات کر رہے ہیں وہ بھی خطا پر ہیں، حق تعلیم ایکٹ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ دس سال کے نصاب کی سال بہ سال درجہ بہ درجہ تکمیل کرائے بغیر ایسا کریں۔ آپ اس کام میں سرکار سے امداد لیں یا نہ لیں، آپ کو اب 6 سے 14 سال کے بچوں کی مروجہ مسلمہ بنیادی تعلیم (Universal Elementry Education) کا انتظام کرنا ہی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اپنے مدرسوں کو بند کر دیں اور سرکار کو ان بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرنے دیں۔ ایک تیسری صورت بھی ہے کہ ان مدارس کو غیر رسمی تعلیم کے مراکز اور دار الاقامہ میں بدل دیں اور ان میں قیام کرنے والے بچوں کو اجازت دیں کہ تعلیم کے اوقات میں وہ منظور شدہ اسکول مدرسے اور کالج میں پڑھا کریں۔



سائنس و تحقیق

طاعون یا افواہ؟ سائبیریا کی ایک موت نے دنیا کو کیوں چونکایا



طارق عبداللہ

2026 / 10 / 08

۱۸ اکتوبر ۲۰۲۶ تک دستیاب معلومات پر مبنی

طاعون پر تحقیق کرنے والے ادارے میں ایک نوجوان کارکن کی موت ہوئی۔ چند دن میں خبر سائبیریا سے نکل کر دنیا بھر میں پہنچ گئی۔ مگر جس سوال کا جواب سب چاہتے ہیں، وہ اب تک ادھورا ہے: کیا یہ واقعی طاعون تھا؟

روس کے شہر ارکتسک کے انسدادِ طاعون تحقیقی ادارے میں کام کرنے والی ۲۸ سالہ داریا شیپیلووا ۱۲ اکتوبر کو انتقال کر گئیں۔ انہیں شدید نمونیا ہوا تھا۔ روسی حکام کا کہنا ہے کہ نمونیا کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ ان کے مطابق خاتون کے ٹیسٹوں میں وہ خطرناک جراثیم نہیں ملے جن پر وہ کام کرتی تھیں۔ apnews.com

ابتدائی خبروں میں ایک اور کہانی سامنے آئی۔ کہا گیا کہ تحقیق گاہ میں ٹیسٹ ٹیوب ٹوٹی اور خاتون طاعون کے جراثیم کی زد میں آ گئیں۔ یہ دعویٰ تیزی سے پھیلا، لیکن اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔ عالمی ادارۂ صحت نے بھی اپنی اطلاع میں لیب کے اندر حادثاتی طور پر جراثیم سے متاثر ہونے کو ابتدائی میڈیا رپورٹس کا دعویٰ بتایا، ثابت شدہ واقعہ نہیں۔ October 20267

یہ فرق پوری خبر کو سمجھنے کی بنیاد ہے۔ تحقیق گاہ میں کام کرنے والے کسی شخص کی موت، اس موت کا کام سے تعلق اور وہاں سے بیماری کا باہر پھیلنا، تین الگ باتیں ہیں۔ ہر ایک کے لیے الگ ثبوت چاہیے۔ ایک بات ثابت ہو بھی جائے تو باقی دو خود بخود ثابت نہیں ہو جاتیں۔

روس نے احتیاطی کارروائی ضرور کی۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق، اس نے تقریباً دو سو ایسے افراد کو قرنطینہ میں رکھا جو خاتون سے رابطے میں آئے تھے۔ یعنی انہیں دوسروں سے الگ کر کے طبّی نگرانی میں رکھا گیا۔ October 7 2026 مگر ایسی کارروائی کا مقصد مشتبہ خطرے کو روکنا ہوتا ہے۔ اسے بیماری کی حتمی تصدیق سمجھنا غلط ہوگا۔

اس دوران ایک اہم پیش رفت بھی ہوئی۔ ۱۸ اکتوبر کو روسی حکام نے بتایا کہ رابطے میں آنے والوں کی طبّی نگرانی مکمل ہو گئی ہے۔ تقریباً پانچ ہزار نمونوں میں خطرناک جراثیم نہیں ملے۔ reuters.com یہ اطمینان بخش اطلاع ہے۔ یہاں پانچ ہزار نمونوں کا ذکر ہے، پانچ ہزار مختلف لوگوں کا نہیں۔ ایک شخص کے کئی نمونے بھی لیے جا سکتے ہیں۔

ارکتسک کے گورنر ایگور کوبزیف نے یہ بھی کہا کہ ادارے میں جراثیم کے ساتھ کام کے دوران کسی حادثے کا ثبوت نہیں ملا۔ ان کے مطابق، کارکن کو متعلقہ

طاعون یا افواہ؟ سائبیریا کی ایک موت نے دنیا کو کیوں چونکایا تسلسل

خطرناک بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے بھی لگے ہوئے تھے۔ vedomosti.ru یہ روسی حکام کا مؤقف ہے۔ تاہم کارکن کی بیماری کی اصل وجہ اب بھی واضح نہیں ہوئی۔

تو پھر دنیا کے سوال ختم کیوں نہیں ہوئے؟

اس لیے کہ بیماری کا دوسروں میں نہ پھیلنا اور پہلی مریضہ کی موت کی وجہ معلوم ہونا، دو الگ باتیں ہیں۔ رابطے میں آنے والوں کے نتائج سے پھیلاؤ کے بارے میں اہم معلومات ملتی ہیں۔ لیکن ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کارکن کو کس جراثیم نے بیمار کیا، یا بیماری کہاں سے لگی۔

۷ اکتوبر کو عالمی ادارۂ صحت کے سربراہ ٹیڈروس ادھانوم گیبریئسس نے کہا کہ مکمل معلومات نہ ملنے کی وجہ سے خطرے کا پورا اندازہ ممکن نہیں۔ ادارے نے روس سے پوچھا کہ متوفیہ اور ان کے رابطوں کے کون سے ٹیسٹ ہوئے، احتیاطی اقدامات کی بنیاد کیا تھی اور زیرِ نگرانی افراد کی صحت کیسی ہے۔ اس نے ایک دوسرے ملازم کے نمونیا میں مبتلا ہونے کی خبروں کی تصدیق بھی مانگی۔ 7 October 2026 دوسرے مریض کی خبر کو بھی ثابت شدہ واقعہ سمجھنا درست نہیں۔

یہاں ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے۔ نمونیا کی وجہ معلوم نہ ہونا، اپنے آپ میں کسی سازش کا ثبوت نہیں۔ نمونیا کے انفرادی مریضوں میں اصل وجہ کبھی معلوم نہیں ہو پاتی۔ reuters.com لیکن ایسے ادارے میں کام کرنے والی کارکن کی اچانک موت پر مفصل تحقیق اور صاف جواب مانگنا بالکل جائز ہے۔

طاعون کا نام اس لیے بھی خوف پیدا کرتا ہے کہ اس کے ساتھ پرانی تباہ کن وباؤں کی یاد جڑی ہے۔ مگر یہ مرض صرف تاریخ کی کتابوں میں نہیں رہ گیا۔ امریکی مراکز برائے امراض کی روک تھام، یعنی سی ڈی سی، کے مطابق یہ آج بھی افریقہ، ایشیا اور مغربی امریکہ کے بعض علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اسے یرسینیا پیسٹس نام کا بیکٹیریا پیدا کرتا ہے۔ انسان عموماً متاثرہ جانوروں کے پسو کے کاٹنے یا متاثرہ جانور سے رابطے کے ذریعے بیمار ہوتے ہیں۔ CDC

اس کا مطلب یہ ہے کہ طاعون کا کوئی مریض ملنے پر بھی تحقیق گاہ سے جراثیم نکلنے کا نتیجہ فوراً نہیں نکالا جا سکتا۔ بیماری کے قدرتی ذرائع کو بھی جانچنا پڑتا ہے۔ ارکتسک کے معاملے میں تو پہلے یہ طے ہونا باقی ہے کہ کارکن کو طاعون تھا بھی یا نہیں۔

جس قسم کے طاعون کا شبہ ظاہر کیا گیا، وہ پھیپھڑوں کو متاثر کرتا ہے۔ اسے پھیپھڑوں کا طاعون، یا نیومونک پلیگ، کہتے ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق، یہ متاثرہ مریض سے سانس کے ذریعے نکلنے والے متعدی ذرات کے راستے دوسرے انسان تک پہنچ سکتا ہے۔ بروقت علاج نہ ہو تو تیزی سے جان لیوا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے محض شبہے پر بھی فوری طبّی نگرانی کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ who.int

اس کے باوجود طاعون کا نام سن کر اسے کورونا جیسی نئی عالمی وبا سمجھ لینا درست نہیں۔ سی ڈی سی کے مطابق، طاعون کا علاج اینٹی بایوٹک دواؤں سے ہو سکتا ہے، بشرطیکہ علاج جلد شروع ہو۔ CDC خطرے کو سمجھنے کے لیے مرض کی تصدیق، متاثرہ افراد کی تعداد اور پھیلاؤ کے شواہد دیکھنا ضروری ہے۔ خوف ناک نام اکیلا خطرے کی سطح نہیں بتاتا۔

البتہ روسی معلومات پر شکوک کا ایک تاریخی پس منظر ضرور ہے۔ ۱۹۷۹ میں سابق سوویت یونین کے شہر سویردلوفسک میں اینتھریکس کی وبا آئی تھی۔ حکام نے اسے آلودہ گوشت سے جوڑا۔ لیکن میتھیو میسلسن اور ساتھیوں کی تحقیق، جو ۱۹۹۴ میں سائنسی جریدے سائنس میں شائع ہوئی، نے نتیجہ نکالا کہ ایک فوجی ادارے سے ہوا میں جراثیم نکلنے کے سبب وبا پھیلی تھی۔ PubMed

یہ تاریخ آج مکمل معلومات کے مطالبے کو وزن دیتی ہے۔ تاہم پرانا واقعہ موجودہ الزام کا ثبوت نہیں بن سکتا۔ ارکتسک میں کیا ہوا، یہ اسی واقعے کے طبّی اور تحقیقی ریکارڈ سے طے ہوگا۔ ماضی ہمیں سوال

طاعون یا افواہ؟ سائبیریا کی ایک موت نے دنیا کو کیوں چونکایا تسلسل

کرنے کی وجہ دیتا ہے، جواب پہلے سے طے کرنے کا حق نہیں۔

بھارت کے لیے بھی یہ بحث اجنبی نہیں۔ ۱۹۹۴ میں سورت اور دوسرے علاقوں سے طاعون کی خبروں نے بین الاقوامی تشویش پیدا کی تھی۔ اس وقت سی ڈی سی کی ایک رپورٹ نے اعداد و شمار کی قابلِ اعتماد حیثیت اور بیماری کی تصدیق کے معیار پر سوال اٹھائے۔ اسی رپورٹ میں بتایا گیا کہ امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ پہنچنے والے جن بیمار مسافروں کا معائنہ ہوا، ان میں طاعون کی تشخیص نہیں ہوئی۔ cdc.gov اس تجربے کا سبق یہی ہے کہ شبہ، تشخیص اور پھیلاؤ کو الگ الگ بیان کرنا چاہیے۔

آج ارکتسک کے معاملے میں بھی عوام کو ایسے ہی واضح جواب درکار ہیں۔ کارکن کے کون سے ٹیسٹ ہوئے؟ کون سے جراثیم تلاش کیے گئے؟ علاج کب شروع ہوا؟ کام کے دوران ممکنہ حادثے کی جانچ کیسے ہوئی؟ اگر کوئی خطرناک جراثیم نہیں ملا تو موت کی وجہ معلوم کرنے کے لیے مزید کیا کیا گیا؟ جہاں جواب ابھی معلوم نہیں، وہاں یہی بات صاف کہی جائے۔

خطرناک بیماریوں پر تحقیق کرنے والے اداروں کو محض ان کے کام کی وجہ سے مجرم سمجھنا بھی غلط ہے۔ ایسی تحقیق بیماریوں کی شناخت، علاج اور روک تھام کے لیے ضروری ہے۔ لیکن عوام کے اعتماد کے لیے مؤثر حفاظتی انتظام، حادثات کی قابلِ اعتماد جانچ اور بروقت اطلاع بھی ضروری ہیں۔ سائنسی تحقیق کی حمایت اور ادارے سے جواب طلب کرنا ایک ساتھ ممکن ہے۔

یہ اصول ہر حکومت پر یکساں لاگو ہونا چاہیے۔ صحت کا سوال سیاسی پسند اور ناپسند کے تابع نہیں ہو سکتا۔ روسی دعوے ہوں یا کسی اور ملک کے الزامات، فیصلہ قابلِ جانچ ثبوت پر ہونا چاہیے۔ کارکن اور ان کے خاندان پر بغیر ثبوت ذمہ داری ڈالنا بھی انصاف نہیں۔

۱۸ اکتوبر تک دستیاب معلومات طاعون سے اس موت یا تحقیق گاہ سے بیماری کے باہر پھیلنے کو ثابت نہیں کرتیں۔ روس کے بتائے ہوئے منفی نتائج اطمینان کی وجہ ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کی مانگی ہوئی مزید تفصیل پھر بھی ضروری ہے۔ کسی خطرے کا ثابت نہ ہونا، تحقیقات کے ہر سوال کا جواب مل جانا نہیں ہوتا۔ reuters.com

سائبیریا کی اس خبر میں ایک نوجوان عورت کی جان گئی ہے۔ ان کی موت کی وجہ جاننے کا حق ان کے خاندان کو بھی ہے اور عوام کو بھی۔ دنیا کو خوف ناک قیاس سے زیادہ اس جواب کی ضرورت ہے: دار یا کے ساتھ کیا ہوا، اور اسے جاننے کے لیے اب تک کیا کیا گیا؟

تاریخ و تحقیق

مسلم مجاہدینِ آزادی جن کو یاد رکھنا ہر ہندوستانی پر واجب ہے



ابو عبداللہ احمد

2026 / 09 / 10



مضمون کی ویب اشاعت سے

ہندوستان کی جنگ آزادی ایک وسیع البنیاد قومی تحریک تھی جو ایک صدی سے زائد عرصے پر پھیلی ہوئی ہے اور مسلم مجاہدین آزادی نے اس جدوجہد میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ ان کی قائدانہ خدمات اور مجاہدانہ قربانیاں ہر ہندوستانی کے لیے، خواہ وہ کسی بھی مذہب اور علاقے کا ہو، ناقابل فراموش اور قابل تقلید ہیں۔ ان میں کثیر تعداد علمائے دین، سیاسی و سماجی قائدین، انقلابیوں، فوجیوں، صحافیوں اور سماجی مصلحین کی ہے، جن کے نظریات اور قربانیوں نے تحریک آزادی کو واضح شکل دی اور ہندوستان کو صحیح معنوں میں ایک ملک اور ایک قوم بنایا۔

یہ قائدین مختلف سیاسی روایات و نظریات اور مختلف طریقہائے مزاحمت کی نمائندگی کرتے تھے لیکن ان کی خواہش ایک تھی۔ برٹش حکومت کا خاتمہ اور ایک ایسے ہندوستان کا قیام جہاں انصاف، وقار، خوشحالی اور خود مختاری کا راج ہو۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو ان کے متنوع طریقوں نے تقویت بخشی۔ ان کو اس لیے بھی یاد رکھنا لازمی ہے کہ ہم ان کی قربانیوں کے مقروض ہیں اور اس لیے بھی کہ ان کی جدوجہد میں ہمارے لیے بہت سی روشنی اور بہت سے سبق موجود ہیں۔

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) اور اس سے پہلے ملک و قوم کے جذبہ حریت کی آبیاری کرنے والوں میں سلطنت دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر (1775-1862) کو بھلا کون فراموش کر سکتا ہے، جن کو بغاوت کے جرم میں رنگون جلاوطن کیا گیا اور جن کی شاعری آج بھی دلوں میں وطن کی محبت کی شمعیں روشن کرتی ہیں، علامہ فضل حق خیر آبادی جنھوں انگریزوں کی غلامی کے خلاف جہاد کا پہلا فتویٰ دیا اور اپنی آخری سانسوں تک اس پر ڈٹے رہے، بیگم حضرت محل (1820-1879) جنھوں نے دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی طرح لکھنؤ میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی قیادت کی اور جلاوطنی میں جان دے دی لیکن ہتھیار نہیں ڈالا، حاجی بیگم شہید (ملکہ سہسرام) جنھوں نے راجا کنور سنگھ کے شانہ بہ شانہ انگریزوں سے لوہا لیا اور موت کو گلے لگایا لیکن بابو کنور کا ساتھ چھوڑنے کی پیشکش قبول نہیں کی۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی جنھوں نے فتوی جہاد کے جرم میں کالا پانی کی جلاوطنی اور سزائے قید برداشت، مولانا کافی مرادآبادی جنھوں نے مجاہدین آزادی کی قیادت کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور نغمۂ آزادی گاتے ہوئے پھانسی کے پھندے کو چوم لیا، مولوی احمداللہ شاہ، مولانا فیض احمد بدایونی، جنرل بخت احمد، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، عبد الغفار خان (حاکم جھجر) اور دوسرے انگنت علماء و قائدین جنھوں نے یا تو شہادت کا جام پیا، یا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں یا پھر جلاوطنی اور گمنامی میں زندگی کے آخری ایام گذارے اور اپنی آنے والی نسلوں کو وہ آدرش دے گئے جن پر چل

مسلم مجاہدینِ آزادی جن کو یاد رکھنا ہر ہندوستانی پر واجب ہے تسلسل

کر نئے ہندوستان کو وہ معماران وطن ملے جنھوں نے اس جہاز کو ڈوبنے سے بچایا اور طوفانوں سے نکالا۔ان میں چند کا ذکر یہاں نہایت اختصار سے ملاحظہ کریں:

1۔ مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958) مولانا ابوالکلام آزاد قومی تحریک کے صف اول کے دانشوروں اور ان قوم پرور رہنماؤں میں سے ایک تھے جنھوں نے اس جدید ہندوستان کی فکری بنیادیں استوار کیں اور آزادی کے بعد اس کی عملی تعبیرات وضع کیں۔ایک ممتاز عالم، صحافی، اور سیاسی مفکر جنھوں نے ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کے ثقافتی تنوع کو اس کی قومی شناخت کی بنیاد قرار دیا۔ تحریک عدم تعاون اور ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران مہاتما گاندھی کے شانہ بہ شانہ کام کیا۔ طویل مدتت تک قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔انڈین نیشنل کانگریس کے سب سے کم عمر صدر کے طور پر خدمات انجام دیں، سب سے طویل مدت تک کانگریس کے صدر رہے اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم ہوئے۔ان کا نقطہ نظر سیاسی آزادی سے آگے ایک تعلیم یافتہ، سائنسی ذہن رکھنے والی اور ثقافتی طور پر پُر اعتماد قوم کی تخلیق تک پھیلا ہوا تھا اور وہ آج بھی ہندوستان کو راہ دکھا رہا ہے۔یو جی سی، آئی آئی ٹی اور ساہتیہ اکادمی جیسے ادارے ان کے ذہن رسا کی تخلیق ہیں جنھوں نے نئے ہندوستان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

2۔ مولانا حسرت موہانی (1875-1951) مولانا حسرت موہانی ایک نامور شاعر، صحافی اور انقلابی رہنما تھے۔ مکمل آزادی (پورن سوراج) کی مانگ سب سے پہلے انہوں نے پیش کی، انقلاب زندہ باد کا نعرہ ہندوستان کو انہوں نے دیا اور اس کو مقبول بنایا۔ نو آبادیاتی حکمرانی کی بے خوف مخالفت کے لیے ان کو ہمیشہ رکھا جائے گا۔ آئین ساز اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے بھی ان کا کردار یادگار ہے۔ ہندو مسلم ہم آہنگی اور گنگا جمنی تہذیب کے پرجوش وکیل تھے۔ کرشن کی شان میں ان کا کلام اپنی مثال آپ ہے۔ تحریک آزادی میں قید وبند کی مشقتیں سب سے زیادہ برداشت کرنے والے رہنماؤں میں شامل تھے۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو ادب کو بھی مالا مال کیا اور عشق و محبت، آزادی، مساوات، سماجی انصاف اور حب الوطنی پر مبنی ان کی شاعری ہندوستان کو نسل در نسل متاثر کرتی رہی ہے۔

3۔ مولانا محمد علی جوہر (1878ء-1931ء) مولانا محمد علی، ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی (علی برادران) اور ان کی والدہ نے جنگ آزادی میں جسم و جاں کی بازی لگادی تھی۔ جوہر نے کامریڈ (انگریزی) اور ہمدرد (اردو) اخبارات نکالے۔ خلافت تحریک منظم کی اور اس کے ذریعے رائے عامہ کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا، گاندھی جی کو خلافت تحریک کی شکل میں وہ پلیٹ فارم دیا جس نے ان کو ماورائے نسل و مذہب مقبولیت دی اور تحریک عدم تعاون کے دوران گاندھی جی کے شانہ بہ شانہ کام کیا۔ 1920 کی دہائی کے اوائل میں نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف ملک گیر مہم چلائی۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اس کے باوجود لندن گئے کہ ان کی طبیعت شدید ناساز تھی، برطانوی حکومت سے کہا کہ وہ آزادی لے کر جائیں گے یا پھر اسے ان کو قبر کے لیے زمین دینا ہوگی کیونکہ وہ ایک غلام ملک میں دفن ہونا نہیں چاہتے۔ پھر وہیں ان کا انتقال ہوا اور تدفین کے لیے ان کو بیت المقدس (یروشلم) لے جایا گیا۔

4۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن (1851-1920) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، پوری اسلامی دنیا میں قابل احترام مانے جاتے ہیں، برطانوی راج کے خلاف ریشمی رومال تحریک کی قیادت کی۔ انگریزوں کے ذریعے حجاز سے گرفتار کر کے مالٹا میں قید کیے گئے۔ رہائی کے بعد وطن لوٹ کر تحریک خلافت منظم کیا، جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں شامل تھے، ترک موالات کا فتویٰ دیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسہ تاسیس کا خطبہ صدارت انہوں نے ہی دیا تھا۔

5۔ مولانا عبید اللہ سندھی (1872-1944) مولانا عبید اللہ سندھی ریشمی رومال تحریک کے قائدین میں شامل تھے۔ افغانستان کو ہجرت کی، راجا مہندر پرتاپ (صدر) اور مولانا برکت اللہ بھوپالی (وزیر اعظم) کی قیادت میں پہلی جلاوطن حکومت ہند بنائی، ہندوستان کی بیرون ملک انقلابی کوششوں کو منظم کیا، برطانوی راج کے خلاف بین الاقوامی

مسلم مجاہدینِ آزادی جن کو یاد رکھنا ہر ہندوستانی پر واجب ہے تسلسل

حمایت حاصل کرنے کے لیے کئی ملکوں کا سفر کیا۔

6۔ مولانا حسین احمد مدنی (1879-1957) متحدہ قومیت کے مضبوط وکیل اور جمعیۃ علماء ہند کے رہنما مولانا حسین احمد مدنی نے تحریک آزادی میں ایک سے زائد بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ پہلی دفعہ اپنے استاذ و مربی شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ساتھ حجاز سے گرفتار کیے گئے۔ دوسری دفعہ بھارت چھوڑو تحریک کے دوران جیل بھیجے گئے۔ دو قومی نظریہ کی سخت مخالفت کے لیے یاد کئے جاتے ہیں۔ اس کے لیے بڑی سخت مخالفتیں اور تنقیدیں جھیلیں لیکن اپنے موقف سے کبھی ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے، تحریک آزادی کے فیصلہ کن مرحلے میں تو تقسیم کے خلاف اپنی ساری صلاحیتیں لگادی تھیں۔

7۔ اشفاق اللہ خان (1900-1927) اشفاق اللہ خان ہندوستان کے سب سے مشہور انقلابی مجاہدین آزادی میں سے ایک ہیں۔ وہ ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن کے رکن تھے۔ انہوں نے رام پرساد بسمل اور چندر شیکھر آزاد جیسے انقلابیوں کے ساتھ کام کیا۔ 1925 کے کاکوری ٹرین ایکشن میں حصہ لیا جو برطانوی حکومت کے خلاف انقلابی تحریک کے لیے فنڈز حاصل کرنے کے لیے کی گئی کارروائی تھی۔ گرفتار کرکے سزائے موت سنائی گئی اور صرف ستائیس سال کی عمر میں ان کو پھانسی دے دی گئی۔ ان کی ہمت، شجاعت، حب الوطنی اور قربانی نوجوان ہندوستانیوں کی نسلوں کو متاثر کرتی رہی ہے۔

8۔ حکیم اجمل خان (1868-1927) مسیح الملک حکیم اجمل خان ایک ممتاز طبیب، ماہر تعلیم اور قوم پرور رہنما تھے۔ تحریک عدم تعاون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، تعلیمی اصلاحات اور قومی بیداری کے لیے کام کیا، جامعہ کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی زندگی عوامی خدمت، تعلیم، تہذیب اور بین المذاہب ہم آہنگی کا نمونہ تھی۔

9۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری (1880-1936) ڈاکٹر ایم اے انصاری ملک کے ایک مشہور طبیب اور انڈین نیشنل کانگریس کے ایک بااثر رہنما تھے۔ خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آئینی اصلاحات، جمہوری شراکت داری اور قومی اتحاد کی مسلسل وکالت کی۔ بہت سے سیاسی و سماجی رہنماؤں کی مالی مدد جیب خاص سے کرتے تھے. ان کی قیادت نے تحریک آزادی کے اہم مراحل میں ہندوستانی سماج کے مختلف طبقات کے درمیان تعاون کو مضبوط بنانے میں مدد کی۔ وہ خلافت تحریک کے سرگرم رہنماؤں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں شامل تھے۔

10۔ خان عبدالغفار خان (1890-1988) سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور خان عبدالغفار خان عدم تشدد کے سب سے بڑے حامیوں میں سے ایک تھے۔ شمال مغربی سرحدی علاقے میں خدائی خدمتگار تحریک کی بنیاد رکھی، جس نے نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف پرامن مزاحمت کے لئے ہزاروں افراد کو متحرک کیا۔ انصاف، خدمت اور انسانی وقار کے اصولوں پر وہ مضبوط اعتقاد رکھتے تھے، انہوں نے اس کے لیے ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر کیا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور جمہوری اقدار کے تئیں ان کی اٹوٹ اور تادم حیات وابستگی نے انہیں امن اور قومی اتحاد کی لازوال علامت بنادیا۔

11۔ وکوم عبدالقادر مولوی (1873-1932) وکوم عبدالقادر مولوی کیرالہ کے ایک بااثر سماجی مصلح، صحافی اور قوم پرور رہنما تھے۔ اخبارات اور تعلیمی اقدامات کے ذریعے انہوں نے سماجی اصلاح، جدید تعلیم اور لوگوں میں سیاسی بیداری کو فروغ دیا۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ ان کی جدوجہد آزادی کا فکری بیداری اور تعلیمی ترقی سے گہرا تعلق تھا جس کے اثرات کیرل اور جنوبی ہند کے ایک بڑے خطے میں آج بھی نظر آتے ہیں۔

12۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (1897۔1969) ممتاز ماہرِ تعلیم، مجاہدِ آزادی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معمار اور ملک کے تیسرے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا ملک کی تعلیمی پالیسی بنانے اور تعلیمی نظام کو عملی ماڈل دینے میں کلیدی کردار ہے۔ تعلیم کی وردھا اسکیم (1937) کی ترتیب و توضیع کی ذمہ داری گاندھی جی نے ان

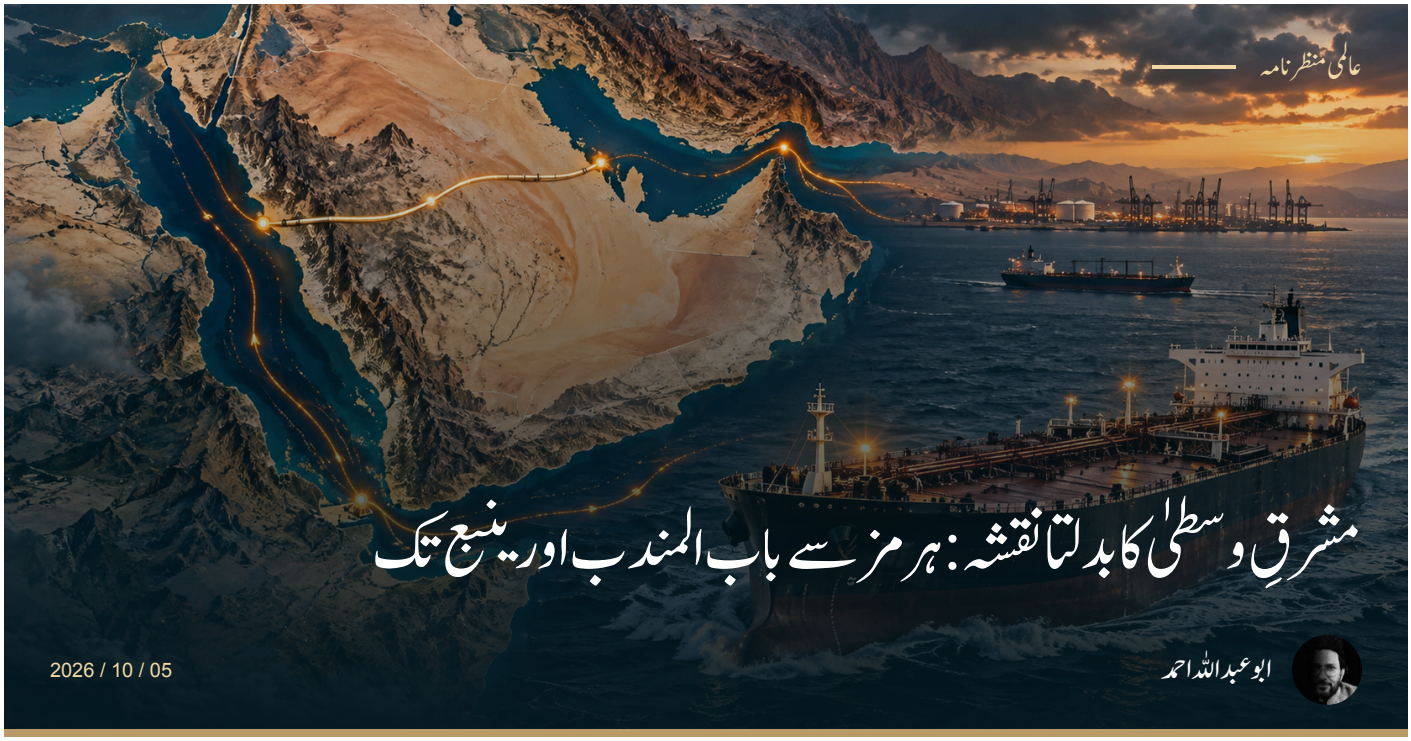
کو سونپی تھی جو قومی تعلیمی پالیسی کی بنیاد بنی۔

13۔ مولانا مظہر الحق (1866۔1930) تحریکِ آزادی کے ممتاز رہنما، ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار اور نامور قانون داں مولانا مظہر الحق نے پٹنہ میں تحریک آزادی کے کارکنان کے لیے صداقت آشرم قائم کیا۔ اس کے لیے گنگا کے کنارے اپنی بیش قیمت وسیع و عریض جائیدادیں وقف کر دیں اور تحریک عدم تعاون کے دوران بہار ودیاپیٹھ قائم کیا اور وہ بہار نیشنل کالج کے بانیوں میں بھی شامل تھے جہاں سے ملک و قوم کو نوجوان قائدین کی تازہ دم تعلیم یافتہ نسلیں ملیں۔ بہار میں کانگریس کے دفاتر اور بہار ودیاپیٹھ آج بھی صداقت آشرم میں ہی ہیں.

14۔ بدرالدین طیب جی (1844ء۔1906ء) نامور وکیل اور مجاہدِ آزادی بدرالدین طیب جی انڈین نیشنل کانگریس کے تیسرے صدر تھے۔ اپنے قوم پرور نظریات کے لیے تاریخ کے اوراق میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خاندان نے ملک کو مجاہدین آزادی کی کئی نسلیں دیں۔ ملک کے ترنگے قومی پرچم کو موجودہ شکل دینے میں ان کے مشورے اور محترمہ ثریا طیب جی کی فنی مہارت کا کردار بہت اہم تھا، موجودہ ترنگا ثریا طیب جی کا ڈیزائن کیا ہوا ہے.

15۔ سیف الدین کچلو (1888۔1963) پنجاب کے ممتاز مجاہدِ آزادی سیف الدین کچلو جلیانوالہ باغ ستیا گرہ کے سرگرم رہنما تھے جو جنگ آزادی کا ایک اہم، اندوہناک لیکن فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔ قومی یکجہتی کے علمبردار تھے۔

سوال یہ ہے کہ ان کو کیوں یاد کیا جائے؟ جواب میں دفتر کے دفتر ناکافی ہوں گے کیوں کہ ان میں ہر شخص ایک مکمل کتاب ہے لیکن اگر مختصر جواب تلاش کریں تو ان رہنماؤں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے لیے متنوع نقطہ نظر کی نمائندگی کی، مثلاً: مسلح مزاحمت (اشفاق اللہ خان، عبید اللہ سندھی)، عدم تشدد کی عوامی تحریکیں (مولانا آزاد، عبدالغفار خان، مختار انصاری)، مذہبی اور فکری قیادت (عبدالباری فرنگی محلی، محمود حسن، حسین احمد مدنی)، صحافت اور سیاسی بیداری (محمد علی جوہر، حسرت موہانی)، خواتین کی قیادت (بیگم حضرت محل، والدہ علی برادران 'بی اماں')، تعلیمی اور ادارہ جاتی قومی تعمیر (حکیم اجمل خان، مولانا مظہر الحق، ڈاکٹر ذاکر حسین) جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک واقعی ایک جامع قومی جدوجہد تھی جس میں ہندوستانی مسلمانوں نے ہم وطنوں کے ساتھ ہر قسم کی قربانیاں دیں۔ ان کی زندگیاں حب الوطنی، انصاف، اتحاد اور آئینی جمہوریت کے نظریات کی ترغیب دیتی ہیں۔



مشرقِ وسطیٰ کا بدلتا نقشہ: ہرمز سے باب المندب اور ینبع تک

ابو عبداللہ احمد

2026 / 10 / 05

امریکہ اور اس کے حلیف ممالک مشرق وسطیٰ کا ایک نیا نقشہ ترتیب دے رہے تھے اور قدرت ایک اور ہی نقشہ وضع کر رہی تھی۔ اب یہ خطہ جنگ، کشیدگی اور سرحدی یا سفارتی تنازعات تک محدود نہیں رہا۔ اس کے جغرافیے میں واقع آبی گزرگاہیں پوری عالمی معیشت، توانائی کی ترسیل اور بین الاقوامی تجارت کے مستقبل کا مسئلہ بن گئی ہیں۔ آبنائے ہرمز، باب المندب، بحیرۂ احمر اور سعودی عرب کی بندرگاہ ینبع کو الگ الگ دیکھنا اب ممکن نہیں ہے۔ ان سب کو ایک مربوط تزویراتی سلسلہ کے طور پر سمجھنا ہوگا۔ ینبع جو اسلام سے پہلے بھی اہم مقام تھا، پیغمبر اسلام ﷺ کی جنگی مہمات میں بھی اسے اہمیت حاصل تھی، امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ کی پسندیدہ سرزمیں ہونے کا شرف بھی رکھتا ہے اور برطانوی جاسوس کرنل لارنس کے لیے بھی یہ اہم تھا، یہیں سے اس نے خلافت عثمانیہ کے زوال کی مہم شروع کی تھی۔ اس کے گاؤوں اور باغات کی کئی تاریخی تصویریں لارنس کی یادگار ہیں۔

اکتوبر 2026 کے آغاز میں مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال انتہائی پیچیدہ ہے۔ خود مغربی ذرائع کہہ رہے ہیں کہ ایران کے ساتھ امریکہ اور اسرائیل کی جنگ کے اثرات خلیج فارس سے نکل کر بحیرۂ احمر اور یمن تک پہنچ چکے ہیں، ایران اور امریکہ کے درمیان سفارتی روابط کی کوششوں کے باوجود جنگ بندی کا مستقبل غیر یقینی ہے جبکہ آبنائے ہرمز اور باب المندب سے توانائی کی عالمی رسد میں نئے خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ یکم اکتوبر کو بھی آبنائے ہرمز میں ایک ٹینکر کو نقصان پہنچنے کی خبر ہے۔ سعودی عرب اور اس کے حلیف ممالک مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کو درپیش خطرات کے ڈھنڈورے پیٹ رہے ہیں، تاکہ یمن پر حملہ کر کے باب المندب اور ینبع کی بندرگاہ کو محفوظ کر سکیں۔ اسرائیل اور امریکہ اس کھیل میں خطہ کے اپنے نئے نقشے کا مستقبل دیکھ رہے ہیں لیکن اس شطرنج کی بساط ان کے کنٹرول میں نہیں ہے۔

صورت حال نے اس بنیادی حقیقت کو سامنے لا کر رکھ دیا ہے کہ عالمی سیاست میں بعض مقامات اپنی جغرافیائی حیثیت کے باعث معمول سے کہیں زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ ہرمز اور باب المندب ایسے ہی مقامات ہیں۔ آبنائے ہرمز خلیج فارس کو خلیجِ عمان اور بحرِ عرب سے ملاتی ہے۔ دنیا کے بڑے تیل پیدا کرنے والے ممالک—خصوصاً سعودی عرب، عراق، کویت، متحدہ عرب امارات اور قطر—کی توانائی کی برآمدات کے لیے یہ گزرگاہ طویل عرصے سے بنیادی اہمیت رکھتی رہی ہے۔ 2026 کی دوسری سہ ماہی میں ہرمز سے تیل اور پیٹرولیم مصنوعات کی ترسیل صرف 4.9 ملین بیرل یومیہ رہ گئی تھی جبکہ 2025 کی آخری سہ ماہی میں یہ مقدار تقریباً 21.6 ملین بیرل یومیہ تھی یعنی جنگ کے بعد

مشرقِ وسطیٰ کا بدلتا نقشہ: ہرمز سے باب المندب اور ینبع تک تسلسل

اس راستے پر تیل کی نقل و حرکت میں تقریباً 77 فیصد کمی دیکھی گئی۔

یہ محض اعداد و شمار کا مسئلہ نہیں۔ ہرمز میں رکاوٹ کا مطلب عالمی منڈی میں تیل کی قیمت، بیمہ، جہاز رانی، صنعتی پیداوار اور بالآخر اشیائے ضروریہ کی مہنگائی ہے لیکن ہرمز کی اہمیت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ اگر خلیج فارس سے تیل بحری راستے سے باہر نہ نکل سکے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کے لیے کوئی متبادل راستہ موجود ہے؟ یہیں سے ینبع کا کردار سامنے آتا ہے۔ سعودی عرب نے دہائیوں پہلے اس امکان کو محسوس کر لیا تھا کہ خلیج فارس کی صورتِ حال کبھی اس کے تیل کی برآمدات کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ اسی مقصد سے مشرقی سعودی عرب سے بحیرۂ احمر کے ساحل تک ایسٹ ویسٹ پائپ لائن تعمیر کی گئی، جس کے ذریعے خام تیل کو خلیج فارس سے گزرے بغیر مغربی ساحل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس پائپ لائن کا آخری مرکز ینبع ہے، جو بحیرۂ احمر کے ساحل پر سعودی عرب کی ایک بڑی صنعتی اور تیل بردار بندرگاہ ہے۔ جب ہرمز میں کشیدگی بڑھی تو سعودی عرب نے اپنی تیل کی برآمدات کا ایک بڑا حصہ اسی متبادل راستے کی طرف منتقل کر دیا۔ جون 2026 میں ینبع سے تیل کی لوڈنگ تقریباً 3.5 ملین بیرل یومیہ تک پہنچ گئی جبکہ اگست 2025 میں یہ مقدار صرف دو لاکھ چالیس ہزار بیرل یومیہ تھی۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ ہرمز جتنا زیادہ غیر محفوظ ہوتا ہے، ینبع اتنا ہی اہم ہو جاتا ہے لیکن مشرقِ وسطیٰ کے موجودہ بحران کا سب سے پیچیدہ پہلو یہی ہے کہ ینبع سے تیل کو عالمی منڈیوں تک پہنچنے کے لیے بحیرۂ احمر سے گزرنا پڑتا ہے اور بحیرۂ احمر کے جنوبی دروازے پر واقع ہے—باب المندب۔

باب المندب یمن اور افریقہ کے درمیان واقع وہ تنگ سمندری گزرگاہ ہے جو بحیرۂ احمر کو خلیج عدن اور بحرِ ہند سے ملاتی ہے۔ اس کے ذریعے ایشیا اور یورپ کے درمیان بحری تجارت کا ایک بڑا حصہ گزرتا ہے۔ اگر ہرمز خلیج فارس کا دروازہ ہے تو باب المندب بحیرۂ احمر کا عالمی دروازہ۔ یہی وجہ ہے کہ یمن میں انصار اللہ کی پیش قدمی نے محض یمن کے داخلی بحران کو متاثر نہیں کیا بلکہ بین الاقوامی تجارت کے لیے بھی نئی صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ ستمبر میں حوثیوں نے بحیرۂ احمر کے ساحلی علاقوں میں اپنی پوزیشن مضبوط کی اور باب المندب کے قریب واقع علاقوں اور جزائر پر قبضہ مضبوط کر لیا۔ مختلف تجزیوں میں اسے خطے کے بحری راستوں کے لیے اہم پیش رفت قرار دیا گیا ہے۔ ستمبر میں باب المندب سے سعودی تیل کی ترسیل میں نمایاں کمی آئی۔ اس کے برعکس سعودی عرب نے ہرمز کے راستے دوبارہ زیادہ تیل بھیجنا شروع کر دیا۔ ستمبر میں سعودی تیل کی ہرمز سے ترسیل تقریباً 2.58 ملین بیرل یومیہ تک پہنچ گئی جبکہ باب المندب سے اس کی ترسیل تقریباً 2.56 ملین بیرل یومیہ رہ گئی۔ یہ صورتِ حال ایک عجیب تزویراتی دائرہ بناتی ہے۔ ہرمز خطرے میں ہو تو ینبع اہم ہو جاتا ہے؛ ینبع اہم ہو تو باب المندب مزید اہم ہو جاتا ہے؛ اور باب المندب غیر محفوظ ہو تو سعودی عرب دوبارہ ہرمز پر انحصار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جدید دنیا میں یہ تصور عام ہو گیا تھا کہ ٹیکنالوجی، پائپ لائنوں، متبادل توانائی اور عالمی منڈیوں نے جغرافیے کی اہمیت کم کر دی ہے۔ موجودہ بحران اس تصور کی کمزوری اور محدودیت ظاہر کر رہا ہے۔ ایک طرف ایران ہرمز کے قریب موجود اپنی جغرافیائی پوزیشن کے باعث عالمی توانائی کی ترسیل پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، دوسری طرف یمن میں حوثیوں کا باب المندب کے قریب اثر و رسوخ بحیرۂ احمر کے راستے کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح سعودی عرب اپنی وسیع سرزمین اور ایسٹ ویسٹ پائپ لائن کے ذریعے ان دونوں سمندری راستوں کے درمیان ایک متبادل زمینی رابطہ فراہم کرتا ہے۔ اس طرح خلیج فارس، سعودی عرب، ینبع، بحیرۂ احمر اور باب المندب ایک ہی تزویراتی نقشے کے مختلف حصے بن گئے ہیں۔

ستمبر کا واقعہ: موجودہ بحران کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ستمبر میں سعودی عرب کے ایسٹ ویسٹ پائپ لائن پر ڈرون حملے کے بعد ینبع سے تیل کی لوڈنگ عارضی طور پر روک دی گئی تھی۔ پائپ لائن 22 ستمبر کو دوبارہ فعال ہوئی اور 29 ستمبر تک ینبع سے خام اور مصفا تیل کی لوڈنگ دوبارہ شروع

مشرقِ وسطیٰ کا بدلتا نقشہ: ہرمز سے باب المندب اور ینبع تک تسلسل

ہوئی۔ تاہم ابتدائی مرحلے میں اس کی ترسیل جنگ سے پہلے کی سطح سے بہت کم ہے۔ یہ واقعہ اپنے اندر ایک اہم سبق رکھتا ہے۔ متبادل راستہ صرف اس وقت متبادل رہتا ہے جب اس کا پورا سلسلہ محفوظ ہو۔ اگر پائپ لائن، بندرگاہ یا اس سے آگے کی سمندری گزرگاہ میں سے کسی ایک پر حملہ یا رکاوٹ پیدا ہو جائے تو متبادل نظام کی افادیت بھی محدود ہو جاتی ہے۔ باب المندب کی اہمیت صرف تیل تک محدود نہیں۔ بحیرۂ احمر کا راستہ ایشیا اور یورپ کے درمیان کنٹینر تجارت کے لیے بھی اہم ہے۔ افریکا سینٹر فار اسٹریٹجک اسٹڈیز کے مطابق بحیرۂ احمر کا سمندری کوریڈور تاریخی طور پر عالمی کنٹینر ٹریفک کے تقریباً 30 فیصد اور عالمی تجارت کے تقریباً 12 فیصد کی راہداری رہا ہے۔ جب جہاز اس راستے کو خطرناک سمجھتے ہیں تو وہ افریقہ کے گرد لمبا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ اس سے سفر کے دن بڑھتے ہیں، ایندھن اور بیمہ کی لاگت بڑھتی ہے اور سپلائی چین میں تاخیر پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اثرات صرف یورپ یا مشرقِ وسطیٰ تک محدود نہیں رہتے۔ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور مشرقی ایشیا کی معیشتیں بھی اس عالمی سمندری نظام سے جڑی ہوئی ہیں۔

موجودہ حالات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کا بحران اب کسی ایک دو فریقی تنازع تک محدود نہیں رہا۔ ایران، اسرائیل، امریکہ، سعودی عرب، یمن کے حوثی، خلیجی ممالک، عراق اور بحیرۂ احمر سے متعلق دیگر ممالک اپنے اپنے مفادات اور سلامتی کے خطرات کے ساتھ اس پیچیدہ صورتِ حال کا حصہ بن چکے ہیں۔ یمن میں حوثیوں اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ یمنی حکومت کے درمیان لڑائی میں بھی اکتوبر کے آغاز میں اضافہ ہوا۔ 2 اکتوبر کو یمنی حکومت نے تعز کے علاقے میں حوثی اہداف کے خلاف متعدد فضائی حملوں کی اطلاع دی ہے جبکہ تعز کی جغرافیائی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس کا کنٹرول بحیرۂ احمر کے ساحل اور باب المندب تک رسائی کو متاثر کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ بحران صرف تیل کی قیمتوں کا بحران نہیں؛ یہ بحری سلامتی، علاقائی طاقت کے توازن، عالمی تجارت اور ریاستی خودمختاری کا بھی بحران ہے۔

موجودہ حالات میں سب سے اہم سوال یہ نہیں کہ کون سا فریق کسی مخصوص محاذ پر زیادہ طاقت حاصل کر رہا ہے بلکہ اہم یہ ہے کہ کیا خطے کے ممالک اور عالمی طاقتیں ایسے سیاسی انتظام کی طرف بڑھ سکتی ہیں جس میں سمندری راستوں کی آزادی، علاقائی خودمختاری اور شہری آبادی کا تحفظ بنیادی اصول ہوں۔ ہرمز کو بند رکھنے یا کھولنے، باب المندب کو عسکری دباؤ کا ذریعہ بنانے، تیل کی تنصیبات کو نشانہ بنانے یا تجارتی جہازوں کو خطرے میں ڈالنے سے کسی مسئلے کا پائیدار حل نہیں نکلتا۔ اس طرح کے اقدامات کا بوجھ بالآخر صرف حکومتوں یا بڑی کمپنیوں پر نہیں پڑتا؛ عام صارف، مزدور، تاجر اور ترقی پذیر ممالک بھی اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہرمز اور باب المندب کو طاقت کے مظاہرے کی جگہ بین الاقوامی تعاون اور محفوظ جہاز رانی کی علامت بنایا جائے۔ خلیج فارس اور بحیرۂ احمر کے ممالک کے درمیان مستقل بحری سلامتی کا نظام، علاقائی مکالمہ، جنگ بندی کے قابلِ عمل انتظامات اور بین الاقوامی قوانین کے تحت آزادانہ جہاز رانی کا تحفظ اس بحران سے نکلنے کی بنیادی شرائط ہو سکتی ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے موجودہ بحران کو اگر صرف تہران، تل ابیب، واشنگٹن یا صنعا کی سیاسی کشمکش کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی مکمل تصویر سامنے نہیں آتی۔ اصل تصویر سمندر میں بنائی جا رہی ہے—آبنائے ہرمز میں، باب المندب میں، بحیرۂ احمر میں اور ینبع کی بندرگاہ پر۔ ہرمز بتاتا ہے کہ خلیج فارس کی طاقت عالمی توانائی کے نظام سے کتنی گہری جڑی ہوئی ہے؛ باب المندب یاد دلاتا ہے کہ یمن کا بحران عالمی تجارت کے دروازے تک پہنچ سکتا ہے؛ اور ینبع یہ دکھاتا ہے کہ متبادل راستہ اختیار کرنا ممکن تو ہے، مگر جب متبادل راستہ بھی جنگ کے دائرے میں آ جائے تو کوئی بھی جغرافیہ مکمل تحفظ کی ضمانت نہیں دیتا۔ آج مشرقِ وسطیٰ کو شاید سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ مزید محاذ آرائی نہیں بلکہ محفوظ راستے، سیاسی مکالمہ اور پائیدار امن ہے کیونکہ ہرمز سے باب المندب تک سمندر میں پیدا ہونے والی ہر بڑی رکاوٹ کی لہریں بالآخر مشرقِ وسطیٰ کی حدود سے نکل کر پوری دنیا کے بازاروں، معیشتوں اور گھروں تک پہنچتی ہیں۔



ہر قطرہ، زندگی

پانی کی قدر کریں۔ نل بند رکھیں، رساؤ درست کریں،

اور روزمرہ استعمال میں پانی بچائیں۔



۱۷۰ کلو میٹر کا خواب: سعودی عرب کے شہرِ مستقبل کو کیا ہوا؟

ثقافت ادارتی شعبہ

2026 / 10 / 04

۱۷۰ کلو میٹر کا خواب: سعودی عرب کے شہرِ مستقبل کو کیا ہوا؟

آئینے کی دیواروں میں توّے لاکھ انسانوں کو بسانے کا تصور دنیا کو حیران کر گیا تھا۔ پھر تعمیراتی معاہدے منسوخ ہونے لگے اور خواب کی زبان بدل گئی۔ نیوم کی کہانی ہمیں مستقبل کے بارے میں کیا بتاتی ہے؟

فرض کیجیے، آپ صبح گھر سے نکلتے ہیں۔ نہ سڑک پار کرنی ہے، نہ ٹریفک میں پھنسنا ہے۔ دفتر، اسکول، اسپتال اور روزمرہ کی ضرورتیں قریب ہیں۔ آپ جس شہر میں رہتے ہیں، وہ دور دور تک پھیلی آبادی نہیں، صحرا کے بیچ کھڑی ایک عظیم الشان عمارت ہے۔ اس کی بیرونی دیواریں آئینے کی طرح چمکتی ہیں اور اندر زندگی کئی منزلوں میں آباد ہے۔

یہ کسی ناول کا منظر نہیں تھا۔ سعودی عرب نے دنیا کے سامنے ایسا ہی ایک شہر بنانے کا تصور پیش کیا تھا: دی لائن۔

مگر اس خواب میں ایک سوال شروع سے موجود تھا، جسے چمکتی تصویروں کے درمیان آسانی سے نظرانداز کیا جا سکتا تھا: ایسی عمارت بن بھی جائے تو کیا وہ ایک کامیاب شہر بن جائے گی؟

آج، جب نیوم کے بعض بڑے منصوبوں کے معاہدے منسوخ ہو چکے ہیں اور دی لائن کی سرکاری وضاحت مرحلہ وار تعمیر پر زور دے رہی ہے، وہی سوال پہلے سے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ neom.com

اس کہانی کو سمجھنے کے لیے ہمیں صحرا سے پہلے اس خواب کے اندر جانا ہوگا۔

۲۴ اکتوبر ۲۰۱۷ کو محمد بن سلمان نے نیوم کا اعلان کیا۔ شمال مغربی سعودی عرب میں تقریباً ۲۶ ہزار ۵۰۰ مربع کلو میٹر پر محیط اس خطے کے لیے آنے والے برسوں میں ۵۰۰ ارب ڈالر سے زیادہ سرمایہ فراہم کرنے کا تصور پیش کیا گیا۔ مقصد صنعت، ٹیکنالوجی اور نئے کاروباروں کے ذریعے سعودی معیشت کو متنوع بنانا تھا۔ یہ رقم مستقبل کی سرمایہ کاری کا اعلان تھی؛ اسے پہلے ہی خرچ ہو چکی رقم سمجھنا درست نہیں۔ the destination for the future

نیوم کو محض ایک شہر سمجھنا بھی غلطی ہو گی۔ یہ کئی منصوبوں پر مشتمل ایک وسیع خطہ ہے۔ لیکن اس کا سب سے مشہور چہرہ دی لائن بنا، جس نے شہری زندگی کی مانوس تصویر ہی بدل دینے کا وعدہ کیا تھا۔

۲۰۲۲ میں پیش کیے گئے ڈیزائن کے مطابق دی لائن ۱۷۰ کلو میٹر طویل، صرف ۲۰۰ میٹر چوڑی اور ۵۰۰ میٹر بلند ہونی تھی۔ آخر کار اس میں توّے لاکھ لوگوں کو

۱۷۰ کلومیٹر کا خواب: سعودی عرب کے شہرِ مستقبل کو کیا ہوا؟ تسلسل

بسانے کا تصور تھا۔ روزمرہ سہولتوں تک پانچ منٹ کی پیدل رسائی اور تیز رفتار ریل سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیس منٹ میں پہنچنے کا وعدہ بھی اسی خاکے کا حصہ تھا۔pif.gov.sa

ذرا ٹھہریے: ۱۷۰ کلومیٹر لمبا شہر، مگر چوڑائی صرف ۲۰۰ میٹر!

عام شہر پھیلتے ہیں۔ ان میں نئی سڑکیں، نئی بستیاں اور نئے کاروباری مرکز بنتے ہیں۔ دی لائن کے تصور میں اس پھیلاؤ کو ایک باریک، طویل پٹی میں سمیٹنا تھا۔ زمین پر پھیلنے کے بجائے زندگی اوپر نیچے تہوں میں آباد ہوتی۔ دیکھنے میں یہ خیال اتنا غیر معمولی تھا کہ اس نے ایک مشکل سوال کو تقریباً پس منظر میں دھکیل دیا: اس کے اندر روزمرہ زندگی کیسے چلے گی؟

کسی عمارت کی تصویر میں اسپتال ایک روشن نشان ہوتا ہے؛ حقیقی زندگی میں وہاں مریض پہنچتے ہیں، ایمبولینس آتی ہے، عملہ ڈیوٹی بدلتا ہے اور سامان کی ترسیل ہوتی ہے۔ اسی طرح اسکول صرف ایک کمرہ نہیں، بچوں، والدین، اساتذہ اور ان کے مختلف اوقات کا پورا نظام ہے۔ ایک شہر میں لاکھوں ایسی ضرورتیں بیک وقت حرکت کرتی ہیں۔

یہ انجینئرنگ اور شہری منصوبہ بندی کا بنیادی مسئلہ ہے: عمارت کی شکل طے کر دینا، اس کے اندر زندگی کی تمام صورتیں طے کر دینا نہیں ہوتا۔

بیس منٹ میں ۱۷۰ کلومیٹر کا سفر بھی ایک دلچسپ حساب سامنے لاتا ہے۔ اس کے لیے اوسط رفتار تقریباً ۵۱۰ کلومیٹر فی گھنٹہ بنتی ہے۔ یہ اعلان کردہ فاصلے اور وقت سے نکلا ہوا حساب ہے، کسی ٹرین کی مصدقہ رفتار نہیں۔ اگر سفر میں رکنا، مسافر اتارنا اور دوبارہ رفتار پکڑنا بھی شامل ہو، تو نظام پر تقاضے مزید بڑھ جاتے ہیں۔

یوں ایک دلکش وعدہ، انجینئر کے سامنے پہنچتے ہی کئی مشکل سوالوں میں بدل جاتا ہے۔

پھر تعمیر کے بعد کا سوال آتا ہے: لوگ یہاں رہنے کیوں آئیں گے؟

کوئی خاندان صرف عمارت کی شہرت کی وجہ سے اپنا شہر نہیں چھوڑتا۔ اسے روزگار، مناسب رہائش، بچوں کی تعلیم، سماجی تعلقات اور اپنے مستقبل پر اعتماد چاہیے۔ کوئی کاروبار بھی محض اس لیے دفتر نہیں کھولتا کہ کھڑکی سے منظر حیرت انگیز ہے۔ اسے گاہک، کارکن، رسد اور قابلِ اعتماد قواعد درکار ہوتے ہیں۔

شہر کی کامیابی کا امتحان افتتاح کی رات نہیں، اس کے بعد کی عام صبحیں ہوتی ہیں۔

نیوم کی مشکلات کا ایک پہلو مالی تخمینوں سے بھی سامنے آیا۔ مارچ ۲۰۲۵ کی وال اسٹریٹ جرنل رپورٹ نے داخلی دستاویزات کے حوالے سے بتایا کہ ایک مسودۂ پیشکش میں نیوم کو ۲۰۸۰ تک مکمل تصور کے مطابق بنانے کے لیے ۸٫۸ ٹریلین، یعنی ۸۸ کھرب ڈالر کا تخمینہ تھا۔ رپورٹ نے بعض انتظامی افراد کی جانب سے مالی اعداد میں دانستہ ردوبدل کے الزامات بھی نقل کیے۔ یہ خرچ ہو چکی رقم یا عوامی طور پر منظور شدہ حتمی بجٹ نہیں، رپورٹ شدہ تخمینہ اور الزامات تھے۔ wsj.com

اس فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پھر بھی، اتنا بڑا تخمینہ ایک بنیادی سوال اٹھاتا ہے: کسی تصور کی قیمت کب اتنی بڑھ جاتی ہے کہ خود اس تصور پر دوبارہ غور کرنا لازم ہو جائے؟

اسی مقام پر منصوبے کی انتظامی ثقافت اہم ہو جاتی ہے۔ کسی بھی بڑے ادارے میں اگر کامیابی کی خبر سنانا آسان اور مشکل بتانا نقصان دہ ہو، تو خطرات وقت پر سامنے نہیں آتے۔ جو اعتراض ابتدا میں نقشے کی معمولی اصلاح سے حل ہو سکتا تھا، وہ بعد میں تعمیر، وقت اور سرمائے کا بڑا مسئلہ بن سکتا ہے۔ یہ ایک عمومی انتظامی سبق ہے؛ اسے نیوم کے ہر فیصلے کی ثابت شدہ وجہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

بڑے خواب کو ایسے ماہرین بھی درکار ہوتے ہیں جو یہ کہہ سکیں: اس حصے کا حساب دوبارہ کیجیے۔

۱۷۰ کلو میٹر کا خواب: سعودی عرب کے شہرِ مستقبل کو کیا ہوا؟ تسلسل

۲۰۲۶ میں سامنے آنے والی بعض تبدیلیاں، تاہم، محض قیاس نہیں رہیں۔

نیوم کے پہاڑی منصوبے ترو جینا کو ۲۰۲۹ کے ایشیائی سرمائی کھیلوں کی میزبانی مل چکی تھی۔ مگر ۵ فروری ۲۰۲۶ کو اولمپک کونسل آف ایشیا نے انہی کھیلوں کے لیے قازقستان کے شہر الماتی کے ساتھ میزبانی کا معاہدہ کیا۔ یوں ایک اہم بین الاقوامی تقریب ترو جینا کے مستقبل سے الگ ہو گئی۔ anocolympic.org

ترو جینا کے بارے میں ایک عام تاثر کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ یہ منصوبہ یکساں گرم، ہموار صحرا میں نہیں، جبل اللوز کے پہاڑی خطے میں ہے، جہاں بلندی ۲۶۰۰ میٹر تک پہنچتی ہے اور سردیوں میں درجۂ حرارت صفر سے نیچے جا سکتا ہے۔ سوال وہاں سردی کے بالکل ناممکن ہونے کا نہیں، ایک وسیع سیاحتی منصوبے کو تعمیر کرنے اور کامیابی سے چلانے کا تھا۔ neom.com

پھر ۲۵ مارچ ۲۰۲۶ کو تعمیراتی کمپنی ویبلڈ نے اعلان کیا کہ نیوم نے ترو جینا میں تین بندوں، ان سے بننے والی میٹھے پانی کی جھیل اور «دی بو» نامی تعمیر کے معاہدے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کمپنی کے مطابق اس وقت کام تقریباً ۳۰ فیصد مکمل تھا۔ Webuild Group

۲۱ مئی کو اسی کمپنی نے نیوم کے «کنیکٹر» تیز رفتار ریلوے منصوبے کے معاہدے کی منسوخی بھی بتائی۔ اس کام کی پیش رفت تقریباً ۲۰ فیصد تھی۔ ویبلڈ نے کہا کہ اس منسوخی کے ساتھ نیوم کے لیے اس کی تمام سرگرمیاں ختم ہو گئی ہیں۔ یہ ایک کمپنی کے کام کے خاتمے کی تصدیق تھی، پورے نیوم کے بند ہونے کا اعلان نہیں۔ Webuild Group

یہاں ایک اور بات غور طلب ہے۔ تعمیر روک دینے سے اس کی مالی ذمہ داریاں لازماً ختم نہیں ہو تیں۔ ویبلڈ کے مطابق معاہدوں کی شرائط کے تحت پہلے سے کیے گئے کام اور تعمیراتی مقام سے سامان اور عملہ ہٹانے سمیت متعلقہ اخراجات نیوم کو ادا کرنا تھے۔ Webuild Group

یعنی بعض اوقات خواب کو مختصر کرنا بھی ایک مہنگا فیصلہ ہوتا ہے۔

تو کیا نیوم ناکام ہو گیا؟

اس کا جواب ایک لفظ میں دینا اس کہانی کو ضرورت سے زیادہ آسان بنا دے گا۔ بڑے معاہدوں کی منسوخی سنجیدہ پسپائی کی علامت ہے، لیکن نیوم کئی منصوبوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی سرکاری معلومات میں بندرگاہ اور ہوائی اڈے جیسے فعال اثاثے بھی درج ہیں۔ اس لیے پورے خطے کو صرف ایک ترک شدہ کھنڈر قرار دینا دستیاب شواہد سے آگے نکل جانا ہو گا۔ neom.com

البتہ دی لائن کے موجودہ سرکاری تعارف کی زبان غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اب اسے ایسے منصوبے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جو مرحلہ وار اور طلب کے مطابق آگے بڑھے گا۔ neom.com

اس وضاحت کو ابتدائی بڑے وعدوں کے ساتھ رکھ کر دیکھیں تو ایک معنی خیز فرق سامنے آتا ہے: اب تعمیر کی رفتار اور وسعت کو ضرورت کے ساتھ جوڑنے پر زور ہے۔ یہ تبدیلی اس بات کا اعتراف ہو سکتی ہے کہ مستقبل کی آبادی اور کاروبار محض اعلان سے پیدا نہیں ہوتے؛ انہیں قدم بہ قدم راغب کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہماری تعبیر ہے، منصوبے کی تکمیل کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں۔

نیوم کی اصل اہمیت شاید اسی لیے سعودی عرب کی سرحدوں سے باہر بھی ہے۔ نئے شہر بنانے والے حکمران، بڑے کاروبار شروع کرنے والے سرمایہ کار اور اپنے ادارے کو تیزی سے پھیلانے والے منتظم، سب ایک ہی کشش محسوس کر سکتے ہیں: اگر تصور اتنا شاندار ہے تو دنیا اسے قبول کیوں نہیں کرے گی؟

مگر دنیا کا جواب ہمیشہ تصور کی خوب صورتی کے مطابق نہیں آتا۔ لوگ اپنی ضرورت، استطاعت اور اعتماد کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں۔ کامیاب منصوبہ وہ ہوتا ہے جو ان فیصلوں سے سیکھ سکے، اپنے نقشے میں جگہ بنا سکے اور ضرورت پڑنے پر راستہ بدل سکے۔

۲۰۷۰ کلومیٹر کا خواب: سعودی عرب کے شہرِ مستقبل کو کیا ہوا؟ تسلسل

نیوم کا حتمی انجام ابھی لکھا جانا باقی ہے۔ ممکن ہے اس کے کچھ حصے کامیاب ہوں، کچھ چھوٹے ہو جائیں اور کچھ صرف ابتدائی تصویروں میں باقی رہیں۔ مگر اس کی اب تک کی کہانی ایک بات واضح کرتی ہے: مستقبل کا شہر دکھانا اور مستقبل کا شہر بسانا، دو الگ صلاحیتیں ہیں۔

جب اگلی بار ہم کسی شہرِ مستقبل کی چمکتی تصویر دیکھیں، تو عمارت کی بلندی کے ساتھ ایک عام رہائشی کی صبح بھی تصور کریں۔ وہ کہاں کام کرے گا؟ اس کا بچہ کہاں پڑھے گا؟ اس کی آمدنی میں رہائش کیسے آئے گی؟ اور وہ وہاں رہنے کا فیصلہ کیوں کرے گا؟

جس دن ان سوالوں کے جواب تصویروں جتنے پُرکشش ہو جائیں، اسی دن شہرِ مستقبل واقعی مستقبل کا شہر بننے لگے گا۔

اسی تحریر سے

اسی مقام پر منصوبے کی انتظامی ثقافت اہم ہو جاتی ہے۔ کسی بھی بڑے ادارے میں اگر کامیابی کی خبر سنانا آسان اور مشکل بتانا نقصان دہ ہو، تو خطرات وقت پر سامنے نہیں آتے۔

کالم

عصرِ رواں کے نئے بُت، طوفانِ حوادث اور خوابیدہ ملت ـــــ ایک صدائے بیداری

طارق عبداللہ

2026 / 10 / 02



مضمون کی ویب اشاعت سے

علامہ اقبال کے قلم سے اگر وہ آج ہمارے درمیان ہوتے

اے میری قوم کے نوجوانو! جب میں آج کے ہندوستان کے حالات اور تمہاری بے بسی پر نگاہ ڈالتا ہوں، تو میرے سینے میں وہی پرانا درد، وہی کسک اور وہی تڑپ بیدار ہو جاتی ہے۔ ایک طرف دنیا تسخیرِ کائنات اور علم و ہنر کی نئی منزلیں طے کر رہی ہے، اور دوسری طرف تم اپنی ہی زمین پر اجنبی اور حاشیے پر دھکیلے جا رہے ہو۔ اگر آج میں تمہارے درمیان موجود ہوتا، تو میری قلم کی روشنائی تمہارے آنسوؤں اور میرے خونِ جگر سے عبارت ہوتی۔

ذرا آنکھیں کھول کر اپنے اطراف کا جائزہ لو! آج کا ہندوستان ایک عجیب دوراہے پر کھڑا ہے۔ ایک جانب مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence)، سیمی کنڈکٹرز، اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری اور خلا کی تسخیر (ISRO اور NavIC) کے چرچے ہیں۔ دنیا کے بڑے ڈیٹا سینٹرز اور ٹیکنالوجی کے مراکز یہاں قائم ہو رہے ہیں۔ لیکن دوسری جانب، اسی ترقی کی چکاچوند کے سائے تلے، جہالت، تعصب اور ظلم کا ایک تاریک طوفان بھی برپا ہے۔

نوجوان نسل سڑکوں پر ہے، امتحانات کے پرچے چوری ہو رہے ہیں، لاٹھیاں برس رہی ہیں اور اقتدار کے ایوانوں میں زلزلے بپا ہیں۔ اس سیاسی اور سماجی ہیجان میں مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ الیکشن کمیشن کی فہرستوں (SIR) سے تمہارے نام ایک منظم سازش کے تحت اس طرح مٹائے جا رہے ہیں گویا تم اس دھرتی کا حصہ ہی نہ ہو۔ سہارنپور سے لے کر اجین اور شالیمار باغ تک، صدیوں پرانی مساجد اور مدارس پر بلڈوزر چل رہے ہیں۔ گلی کوچوں میں گائے کے نام پر بے گناہوں کا خون بہایا جا رہا ہے، اور نفرت کی اس آگ کو قانون اور اقتدار کی خاموش سرپرستی حاصل ہے۔

مگر اے نوجوان! میری شکایت صرف ان ظالموں سے نہیں، میری سب سے بڑی شکایت تمہاری غفلت اور بے حسی سے ہے۔

کیا تم نے سوچا ہے کہ مساجد کی دیواریں کیوں گر رہی ہیں؟ کیونکہ تم نے اپنے دل کی مساجد کو ویران کر دیا ہے۔ تمہاری ووٹر لسٹوں سے نام اس لیے کٹ رہے ہیں کیونکہ تم نے زمانے کی کتابِ علم سے اپنا نام مٹا لیا ہے۔ جب کوئی قوم علم، تحقیق، اور جدید ہنر سے کنارہ کش ہو کر صرف ماضی کے قصوں اور جذباتی نعروں پر زندہ رہنے کی کوشش کرتی ہے، تو تاریخ اسے بے دردی سے کچل دیتی ہے۔

دنیا سلیکان کی وادیوں (Silicon Valleys) اور مائیکرو چپس میں اپنا مستقبل تراش رہی ہے، اور تم آج بھی چھوٹی چھوٹی فروعی بحثوں، مسلکی جھگڑوں اور احساسِ کمتری کے گرداب میں پھنسے ہو۔ یاد رکھو، آنے والے دور کی جنگ

عصرِ رواں کے نئے بُت، طوفانِ حوادث اور خوابیدہ ملت ــــ ایک صدائے بیدار یہ تسلسل

تلواروں یا جذباتی جلسوں سے نہیں، بلکہ ٹیکنالوجی، معیشت اور اعلیٰ تعلیم سے لڑی جائے گی۔ اگر تم نے اپنے مدارس کی تعلیم کو جدید سائنس اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا، تو تم اس نئی ڈیجیٹل دنیا کے غلام بن کر رہ جاؤ گے۔

میرا اور سرسید کا خواب یہ نہیں تھا کہ تم ظلم کے آگے سر جھکا لو یا مایوس ہو کر بیٹھ جاؤ۔ ہمارا خواب ایک ایسی قوم کا تھا جو ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں جدید سائنس رکھتی ہو۔ جو ظلم کا جواب رو کر نہیں، بلکہ اپنی 'خودی' کو اس قدر بلند کر کے دے کہ ظالم کے ہاتھ کانپ جائیں۔

اٹھو! اپنے اندر جھانکو۔ اس ڈیمو گرافی کمیشنوں اور نقشوں سے خوفزدہ ہونے کے بجائے، خود کو اس قابل بناؤ کہ تم اس ملک کی معیشت، ٹیکنالوجی اور دانشوری کا وہ ناگزیر ستون بن جاؤ جسے گرانا کسی بلڈوزر کے بس میں نہ ہو۔ اگر آج کا مسلمان علم، اتحاد اور خودی کے ہتھیار سے لیس ہو جائے، تو یہ تاریک رات بہت جلد ایک روشن صبح میں بدل سکتی ہے۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!

اسی تحریر سے

کیا تم نے سوچا ہے کہ مساجد کی دیواریں کیوں گر رہی ہیں؟ کیونکہ تم نے اپنے دل کی مساجد کو ویران کر دیا ہے۔

فکرِ فردا

حضور نظام، حضرت جامعی اور جناب بو علی سینا



احمد جاوید 2025 / 06 / 18

بو علی سینا نے ایک مہتر کو لیٹرین صاف کرتے دیکھا۔ وہ فارسی کا ایک شعر گنگنا رہا تھا، جس کا مفہوم کچھ یوں تھا: ''اے میرے نفس! میں صرف تیرے احترام میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں تاکہ تو آرام سے زندگی بسر کر سکے۔'' مطلب یہ کہ لیٹرین کی صفائی بھی ایک شاندار پیشہ ہے اور میں نے یہ پیشہ اپنے نفس کے احترام میں اپنا رکھا ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب ہمارے گھروں میں ایسے لیٹرین (بیت الخلا) ہوا کرتے تھے جس کو مہتر یا جمعدار صاف کیا کرتے تھے۔ ہر دن صبح کو مہترانی یا مہتر آتے، بول و براز کو ٹوکری میں ڈالتے اور شہر سے باہر لے جا کر خالی کر دیتے۔ شہروں میں جب گٹر اور سیپٹک ٹینک بننے لگے، اور نکاسی آب کا نظام (سیوریج سسٹم) متعارف ہوا تو بتدریج یہ سلسلہ ختم ہوا۔ بو علی سینا وزیر تھے۔ وہ بہ حیثیت وزیر شہر کا دورہ کر رہے تھے۔ انہوں نے جمعدار کو دیکھا کہ وہ لیٹرین صاف کر رہا ہے اور شعر گنگنا رہا ہے کہ میں نے یہ پیشہ اپنے نفس کے احترام میں اپنا رکھا ہے۔ بو علی سینا نے جمعدار کو دیکھا، لیٹرین کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا دیا۔ جمعدار نے مڑ کر بو علی سینا کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں کا سوال سمجھ گئے۔ بو علی سینا نے اس سے کہا ''تم اپنے نفس پر اچھا احسان جتا رہے ہو۔ تم اگر سونے چاندی کا کاروبار کرتے یا شہر کے سب سے بڑے تاجر ہوتے اور اس کے بعد نفس پر احسان جتاتے تو بات بھی ہوتی۔'' جمعدار نے یہ سن کر قہقہہ لگایا اور بولا: ''میں اپنے کام میں آزاد ہوں، اسی وقت یہ ٹوکری اسی جگہ چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔ میں کسی بھی گھر کی نوکری چھوڑ سکتا ہوں۔ کیا تم بھی ایسا کر سکتے ہو؟'' جمعدار نے اس کے بعد کہا ''پیشہ چاہے کتنا ہی کمتر ہو، بادشاہوں کی غلامی سے بہر حال بہتر ہوتا ہے''۔ جمعدار کے یہ الفاظ سن کر بو علی سینا کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور اس نے ندامت سے آنکھیں جھکا لیں۔ پچھلے ہفتہ بزرگ شاعر اسرار جامعی نے اپنی ایک تازہ سرگزشت سنائی تو فارسی کی یہ حکایت اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ میری نگاہوں میں پھر گئی۔ میں دیر تک اس خیال میں گم تھا کہ خدایا! غلاموں کا حوصلہ کتنا کم اور ان کے دل کیسے تنگ ہوتے ہیں۔ غلامی سچ مچ بہت بری چیز ہے، یہ حوصلوں پر پہرے اور ذہنوں پر تالے ڈال دیتی ہے اور یہ کہ آزاد ہندوستان میں اردو زبان، ادب اور صحافت کو سب سے زیادہ نقصان جس نے پہنچایا وہ ہماری غلامانہ ذہنیت ہی ہے۔ آزادی آئی تو اوروں کے لیے سلطانی جمہور کا نیا عہد، نئے نواب، نئے جاگیردار، نئے نظام اور نئے حکمراں لائی لیکن ہمارے حصے میں غلاموں کی فوج آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے قائم ایک قومی ادارہ کے مدیر نے اردو ٹائپ رائٹنگ کی مشق کے فارمولہ کو اپنی کسی اشاعت میں جگہ دینے سے صرف اس لیے معذرت کر لی اور مضمون مہینوں اپنے پاس رکھنے کے بعد واپس کر دیا کہ اس میں ان کا نام تھا اور جناب مدیر کو ان کے نام کی تشہیر منظور نہ تھی۔ اب بے چارے جامعی افسردہ ہیں کہ 'جس کام کے لیے حضور نظام دکن میر عثمان علی خاں نے گرانقدر انعامات کا اعلان کیا تھا، اس کام کی آج اتنی بھی قدر نہیں ہے کہ اس کی خاطر خواہ تشہیر ہو سکے اور یہ لوگوں تک اسی طرح پہنچ سکے جس طرح انگریزی زبان کے وہ مختصر فقرے جن میں اس کے تمام حروف تہجی موجود ہیں اور ٹائپ رائٹنگ سیکھنے والے ہر کس و ناکس کے کام آتے ہیں'۔ انہیں کون سمجھائے کہ یہ شاہوں کا نہیں غلاموں کا عہد ہے۔ ایک امریکی سائنس داں کرسٹو فرائل شولز (Christo Friyl Sholes) نے لکھنے پڑھنے میں یکسانیت اور رفتار میں تیزی لانے کے لیے ۲۰-۱۸۱۹ء میں ٹائپ رائٹنگ مشین

حضور نظام، حضرت جامعی اور جناب بو علی سینا تسلسل

ایجاد کی تھی۔اس کے بعد مختلف سائنسداں اور متعدد کمپنیاں مختلف برانڈ اور الگ الگ ناموں سے انگریزی ٹائپ رائٹر کو بہتر سے بہتر بناتے رہے۔اس طرح مینول والیکٹرونک ٹائپ رائٹر اور کمپیوٹر کی ایجاد ہوئی۔ٹائپ رائٹر ساز کمپنی اولی ویٹی(OLLIVITTTEE) نے محسوس کیا کہ ٹائپ رائٹنگ مشین کے لیے ایک ایسا مختصر ترین جملہ ہونا چاہیے جس میں تمام حروف تہجی موجود ہوں تاکہ ایک ہی جملہ میں ٹائپ کرنے والے کی ہر انگلی حروف پر چلی جائے۔جب وہ خود ایسا نہ کر سکے تو اخبارات کے ذریعہ اعلان کیا کہ جو کوئی ایسا جملہ تخلیق کرے گا، سب سے اچھے کو پہلا، اس کے بعد والے کو دوسرا اور پھر تیسرا انعام دیا جائیگا۔ مگر باوجود کوششوں کے صرف دو ہی افراد ایسے جملے بنا سکے۔کوئی تیسرا جملہ شاید آج تک وجود میں نہ آسکا۔ وہی دونوں فقرے اب تک دنیا میں رائج ہیں اور ان میں بھی ایک(The quick brown fox jumps right over the lazy dog)زیادہ مستعمل ہے۔انگریزی کی ٹائپنگ سیکھنے اور مشین کی مرمت کرنے والا اسی جملہ کو یاد رکھتا ہے۔اپنی رفتار کو تیز رکھنے کے لیے اسی سے مشق کرتا اور مشین یا کی بورڈ کا ٹیسٹ بھی اسی سے کرتا ہے۔اردو پر دکن اور نظام دکن کے بے شمار احسانات ہیں۔اس کو ایک باوقار علمی اور کارآمد زبان بنانے میں نظام حیدرآباد کی کوششوں کا جو کردار ہے وہ اس زبان کی تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی اہل علم کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہو سکتا۔لیکن یہ تفصیلات بہت کم لوگوں کے علم میں ہوں گی کہ میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد نے جامعہ عثمانیہ کے کچھ طلبہ کو وظیفہ دے کر انگلینڈ بھیجا تھا کہ وہ انگریزی ٹائپ رائٹر کی طرز پر اردو ٹائپ رائٹر بنائیں۔اردو ٹائپ رائٹر کی ایجاد کے بعد ان طلبہ اور خود حضور نظام نے بھی کافی کوشش کی کہ انگریزی کی طرح اردو میں بھی کوئی مختصر جملہ ہو جس سے ٹائپ رائٹنگ سیکھنے والوں کو سہولت ہو۔اسکے لیے انعامات کا بھی اعلان کیا لیکن اردو میں حروف تہجی زیادہ ہوتے ہیں اس لیے کوئی ایسا جملہ تخلیق نہ کر سکا۔ یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے۔اسرار جامعی زندہ دلان حیدرآباد کے مشاعرے میں شرکت کے لیے حیدرآباد گئے۔وہیں سے اردو ٹائپ رائٹر خرید کر پٹنہ لائے اور اپنے ادارہ اقبال اکیڈمی میں اردو ٹائپ رائٹنگ سکھانے کا نظم کیا۔اخباروں میں اس کا اشتہار بھی دیا۔حیدرآباد میں ہی لوگوں نے ان کو بتایا کہ انگریزی کی طرح اردو میں کوئی ایسا جملہ نہیں ہے جس کی مدد سے تمام حروف تہجی کا احاطہ کر کے ٹائپ سکھایا جا سکے۔پھر کیا تھا؟ وہ اس کوشش میں لگ گئے۔وہ ٹھہرے شاعر اور وہ بھی طنز و مزاح کے۔ایک دن ان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ شاعرانہ تعلّی سے بھرپور ایک ایسا فقرہ حاضر تھا جس میں سوائے ژ کے اردو کے تمام حروف تہجی موجود ہیں۔کل ۲۵ الفاظ پر مبنی اس جملہ میں ۴۷ حروف(ب پ ت ٹ ج چ ح خ د ڈ ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ہ ھ ء) صرف ایک مرتبہ آئے ہیں۔جو حروف دو مرتبہ آئے ہیں وہ جز اور کل دونوں ہی صورتوں میں الگ الگ آئے ہیں۔کسی بھی لفظ کو نکال دیں تو ایک یا کئی حروف غائب ہو جاتے ہیں۔گویا کوئی بھی لفظ بھرتی کا نہیں ہے۔جملہ بامعنی و مختصر ہے اور بہ آسانی یاد ہو جاتا ہے۔جملہ ہے:"اردو ٹائپنگ کوڈ کے الفاظ کی یہ تخلیق شاعر طنز و مزاح اسرار جامعی کی غضب کی ذہانت اور خلوص کی بڑی اچھی مثال ہے۔" بہ غور دیکھیں تو اس جملہ میں اصل الفاظ صرف ۱۶ ہیں، ۹ حروف (کے، کی، و، اور، ہے) ایسے ہیں جو لفظوں کو ملانے کے کام آتے ہیں۔جامعی کی مانیں تو اردو کے تمام حروف تہجی کا احاطہ کرنے والا اس سے مختصر اور آسان و بامعنی جملہ بننا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔خود انہوں نے بہت کوشش کی کہ کوئی دوسرا جملہ بن جائے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔اردو ٹائپ رائٹنگ کے موضوع پر ہندوستان اور پاکستان کی تمام کتابیں چھان ڈالیں مگر کسی میں بھی کوئی ایسا جملہ نہ ملا۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اردو ٹائپ رائٹنگ کی مشق کے اس فقرہ کی تخلیق پر میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد کتنا خوش ہوتے لیکن بدقسمتی سے جامعی نے یہ کام اس وقت

حضور نظام، حضرت جامعی اور جناب بو علی سینا تسلسل

کیا جب ہمارے یہاں حکمرانوں کی نہیں، ان کے غلاموں کی حکمرانی ہے۔ ۱۹۷۹ء میں جب حکومت بہار نے آزاد ہندوستان میں پہلی بار کسی ریاست میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کا فیصلہ کیا تو لوگوں نے کہا کہ اردو کا ٹائپ رائٹر نہیں ہوتا، اس لیے کام میں دشواری ہوگی۔ اس وقت تک کسی کے وہم و گمان میں کہاں تھا کہ ایک دن ٹائپ رائٹر بھی تاریخ کا حصہ بن جائے گا اور اس کی جگہ کمپیوٹر لے لیگا۔ پھر اس کی زیارت میوزیموں میں ہوا کرے گی۔ اس وقت جامعی کا شایع کردہ اشتہار کام آیا۔ وزیر اعلی ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا سے کہا گیا کہ نہ صرف یہ کہ اردو کا ٹائپ رائٹر ہوتا ہے بلکہ پٹنہ میں ٹائپ کرنا سکھایا بھی جاتا ہے۔ ڈاکٹر مشرا مشاہدہ کرنے کے لیے خود اقبال اکیڈمی آئے۔ ان کی آمد کی اطلاع چونکہ پہلے ہی ہوگئی تھی اس لیے جامعی نے انتظامات درست کر لیے تھے۔ وزیر اعلی کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اب تک سینکڑوں طلبہ و طالبات کو اردو ٹائپ رائٹنگ سکھائی جا چکی ہے اور اب بھی سینکڑوں لوگ سیکھ رہے ہیں۔ پھر حکومت نے ۷۶ اٹائپسٹ کی تقرری کا اشتہار دیا تو جامعی نے اخباروں میں اعلان شایع کرایا کہ جن لوگوں نے اقبال اکیڈمی پٹنہ سے ٹائپنگ سیکھی ہے، وہ اپنی سرٹیفکیٹ لے جائیں کیونکہ بہار سرکار اردو ٹائپسٹ کی تقرری کے لیے جگہیں نکال رہی ہے۔ اب لوگ آئے تو انہوں نے ان سے تین تین ماہ کی فیس پیشگی لے کر ان کی سرٹیفکیٹ بنادی اور فوٹو کاپی دے کر ۲۰۰ سے زائد لڑکے لڑکیوں سے درخواستیں دلوادیں۔ درخواست دینے اور انٹرویو میں تین ماہ کا وقفہ تھا، اس مدت میں دن رات محنت کر کے ان لڑکے لڑکیوں کو ٹائپنگ سکھائی اور انٹرویو سے پہلے ان کو اوریجنل سرٹیفکیٹ دے دی۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار ایک ساتھ اردو کے ۷۶ اٹائپسٹوں کی تقرری عمل میں آئی۔ اس کامیابی میں بھی جامعی کے اس جملہ کا بہت اہم رول تھا جس کی وجہ سے اتنی کم مدت میں ان لوگوں نے اردو ٹائپنگ سیکھ لی تھی۔ اسی پس منظر میں ۱۸/اگست ۱۹۸۹ء کو اردو اکادمی دہلی نے اسرار جامعی کو اردو ٹائپ رائٹنگ پر لکچر دینے کے لیے مدعو کیا تھا اور انہوں نے اپنے اس لکچر میں اس فقرہ کی افادیت پر بھی روشنی ڈالی تھی۔ اس وقت سے اردو اکادمی دہلی کے ٹائپ رائٹنگ سیکشن کے انچارج جناب نجم السلام اپنے طلبہ کو اسی جملہ سے مشق کرواتے آرہے ہیں۔ اسرار جامعی جب پہلی بار پٹنہ میں اس جملہ سے مشق کروا رہے تھے، اس وقت بھی لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ یہ تو آپ اپنے نام کی مشق کروا رہے ہیں لیکن وہ ٹھہرے طنز و مزاح کے ایک ایسے شاعر جس کی برجستہ گوئی و حاضر جوابی مشہور ہے۔ بھلا ایسے موقع پر وہ کب خاموش رہنے والے تھے، جامعی نے جناب بو علی سینا سے کہا کہ آپ اپنے یا اپنے دادا جان کے نام سے کوئی جملہ بنادیں تو میں اسی کی مشق کراؤں۔ لیکن المیہ یہی نہیں ہے کہ اردو پر حکمرانوں کی نہیں، غلاموں کی حکمرانی ہے، سانحہ تو یہ بھی ہے کہ ہمارے عہد کے بو علی سینا کی آنکھیں بھی نہیں جھکتیں، ماتھے پر پسینہ کہاں سے آسکتا ہے۔

فکرِ فردا

اکیسویں صدی کا پانی پت اور مکھیوں کی جنگ



احمد جاوید

2025 / 06 / 18



مضمون کی ویب اشاعت سے

احمد جاوید پانی پت کی پہلی جنگ شروع ہوئی تو ایک طرف بہ مشکل تمام تین ہزار سپاہی، چند سو گھوڑے اور چند توپیں تھیں اور دوسری جانب ایک لشکر جرار تھا جن کے سپاہیوں کی صفیں تاحد نگاہ پھیلی ہوئی تھیں، اس لشکر کے گھوڑوں، اونٹوں اور خچروں کو تو جانے دیجئے اس کے ہاتھیوں کی تعداد تین ہزار سے زائد تھی جن پر آزمودہ کار تیر انداز تعینات تھے جن کے نشانے خطا نہیں کرتے۔ ایک فرق اور بھی تھا۔ بابر کے تین ہزار سپاہی باہر سے آئے تھے، وہ حملہ آور اور پردیسی تھے جبکہ ابراہیم لودی کا لشکر جرار اپنے وطن میں تھا اور اسے اس سرزمین پر ہر قسم کی امداد و سہولیات حاصل تھیں۔ کہتے ہیں کہ توپ کے گولوں سے سلطنت دہلی کی فوج کے ہاتھی گھوڑے بدک گئے۔ اپنے ہی سواروں اور اپنے ہی لشکر کے سپاہیوں کو کچلنے لگے لیکن پھر بھی اس لشکر جرار کے سامنے بابر کے تین ہزار سپاہیوں کی بساط ہی کیا تھی۔ وہ تو کہئے کہ اس کے ایک سپاہی کا تیر ہاتھی پر سوار بادشاہ کو لگا اور زخمی ابراہیم لودی بے قابو ہاتھی کی پیٹھ سے زمین پر آ گرا۔ سلطان کی فوج دوبارہ سنبھلنے لگی تھی، بابر کو اپنی شکست صاف نظر آ رہی تھی، اتنے میں اس کے کسی سپاہی نے آگے بڑھ کر زخمی بادشاہ کا سر قلم کیا اور اسے نیزے پر بلند کر دیا۔ اتنی سی بات تھی جس نے بادشاہ کی فوج کے پیر اکھاڑ دیئے اور حملہ آور فوج کا سردار، غزنی کی چھوٹی سی ریاست فرغانہ کا امیر، مرزا عمر شیخ کا بیٹا اور جانشین ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کی جگہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ عہد حاضر کا پانی پت نائن الیون کے بعد افغانستان کے تورا بورا میں برپا ہوا۔ فرق یہ تھا کہ یہاں حملہ آور طاقتیں لشکر جرار لے کر آئی تھیں وہ دنیا کی طاقتور ترین افواج کے بہترین اور آزمودہ کار جرنیلوں کی قیادت اور جدید ترین ہتھیاروں سے لیس تھیں اور ان کے مقابلے پر تھے مٹھی بھر نہتے طالبان۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی پرانی بندوقوں، پرانی تکنیک کے راکٹوں، تھوڑے سے گولے بارود اور غیر تربیت یافتہ سپاہیوں کا نیم منظم لشکر تھا، جو جلد ہی پہاڑوں اور صحرائوں میں چھپ کر گوریلا جنگ لڑنے کے لئے مجبور ہو گیا جبکہ دوسری طرف روشنی کی رفتار سے وار کرنے والے بی 2 اور ایف 15 جیسے جدید ترین طیارے اور میزائیل تھے جو زمین کی تہوں کے اندر تک نشانہ لگا سکتے تھے۔ تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دوہرایا، بی 2 اور ایف 15 کی چنگھاڑ اور قالینی بمباری کے سامنے طالبان کے پیر اکھڑ گئے لیکن حملہ آور طاقتوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس بار اسے نہ بادشاہ کی لاش ملی نہ سر ملا۔ اسامہ زندہ یا مردہ کا نعرہ لگا کر دس سال تک افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی، تورا بورا کی بلند و بالا چوٹیوں کو تہہ و بالا کر دیا، دشوار گذار گھاٹیوں سے لے کر گھنے جنگلوں تک ملک کے چپہ چپہ کی خاک چھانی، افغان مخبروں، جاسوسوں اور غداروں پر اربوں ڈالر پانی کی طرح بہائے، محاذ جنگ پر صف اول کے حلیفوں کی کونسی مانگ تھی جو

اکیسویں صدی کا پانی پت اور مکھیوں کی جنگ تسلسل

پوری نہ کی لیکن بادشاہ کا سر اس کے ہاتھ نہ آنا تھا نہ آیا۔ ہم نہیں کہتے کہ ایبٹ آباد میں امریکہ نے اسامہ کو مار گرانے کا جو دعویٰ کیا تھا، وہ سچ نہ تھا لیکن اس واقعہ کا اصل سچ یہ ہے کہ جس وقت صدر اوبامہ افغانستان سے امریکی افواج کی واپسی کا اعلان کر رہے تھے، امریکی بحریہ کے غوطہ خور کمانڈوز بحر عرب میں اسامہ بن لادن کی لاش تلاش کر رہے تھے۔ اب یہ تلاش حقیقی اور واقعی ہے یا محض تماشہ اور ڈرامہ، یہ تو وہی جانیں لیکن سچ یہی ہے کہ یہ دنیا آج اکیسویں صدی کے پانی پت میں کھڑی ہے اور فاتح کو اپنی فتح کا اعلان کرنے کیلئے بادشاہ کے سر کی تلاش ہے۔ افغانستان کے فاتح کو بادشاہ کا سر چاہئے۔ اور ابھی یہ انتظار باقی ہے کہ یہ کس کے ہاتھ آتا ہے۔ ایک طرف تو اقوام متحدہ سے القاعدہ اور طالبان میں تفریق کی توثیق کرا کے صدر اوبامہ نے امریکہ کی شکست کا اعلان کر دیا ہے اور دوسری طرف وہ ملا عمر اور دوسرے افغان مجاھدین سے مذاکرات میں مصروف ہیں۔ میری یہ بات کسی کو پسند آئے یا نہ آئے لیکن سچ یہی ہے کہ افغانستان میں عالمی طاقتوں کی شکست ہو چکی ہے اور امریکہ جس طرح اس بدنصیب ملک سے جا رہا ہے اس میں طالبان ہی مستقبل کی سب سے بڑی اور نمایاں قوت ہو گی۔ فاتح کون ہو گا یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے۔ جہاں تک شکست کا تعلق ہے تو اس کی سب سے بڑی ذمہ داری خود امریکیوں پر عاید ہوتی ہے۔ 9 سال کی طویل مدت میں وہ اگر متبادل تیار کرنے میں ناکام رہے، افغانوں کا دل نہ جیت سکے، طالبان کا حوصلہ نہ توڑ سکے تو یہ بھلا کس کی ناکامی ہے؟ ساری دنیا کے بہترین دماغوں اور طاقتور ترین فوجی قوتوں نے متحد ہو کر بھی اگر طالبان کو شکست نہ دیا، یا افغانستان کو جیت نہ سکے تو اس کی بنیادی وجہ امریکی سوچ کا عہد وسطی میں ہونا ہے۔ انہوں نے افغانستان کا صدیوں سے طے شدہ اسٹرکچر بدلنے کی کوشش کی جس کا ردعمل ہوا اور وہ طالبان کی مزاحمت کو شکست دینا تو درکنار اسے کمزور کرنے میں بھی ناکام رہے۔ امریکی صدر اوبامہ کا امریکی فوج کے مرحلہ وار انخلا کا اعلان سن کر مجھے بار بار پانی پت کی جنگ اور پندرہویں صدی عیسوی کی دنیا یاد آ رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ افغانستان میں امریکہ کے اس ایڈونچر کا تفصیلی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ امریکیوں کے ساتھ افغانستان میں جو کچھ ہوا یا کیا گیا، طالبان نے یہ جنگ جس طرح لڑی یا لڑ رہے ہیں، پاکستانی ایجنسیوں نے اس جنگ میں جو کردار ادا کیا یا جو کھیل کھیلا، یہ اور ان جیسے دوسرے نکات کا احاطہ چند سو صفحات میں ممکن نہیں ہے، صدام حسین نے عراق کو امریکہ کا دوسرا ویت نام بنا دینے کا دعوی کیا تھا، وہ تو یہ نہ کر سکے لیکن افغانستان کی جنگ امریکیوں کے لئے کئی معنوں میں ویت نام سے بھی مہنگی ثابت ہوئی۔ طالبان کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے کہ انہوں نے افغانستان کو عراق نہیں بننے دیا۔ پاکستانی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل نے نائین الیون کے بعد امریکی فوجیوں پر چاکلیٹ سولجر کی پھبتی کسی تھی اور کہا تھا کہ وہ طالبان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت لوگوں کو لگا تھا کہ وہ زمینی حقائق سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ جنرل حمید گل اور ان کے ساتھیوں کے کئی اندازے غلط ثابت ہوئے لیکن کم از کم ان کی یہ پھبتی صد فیصد درست ثابت ہوئی۔ وقت کے ساتھ امریکہ اپنی تمامتر ٹکنالوجی کے باوجود طالبان جنگجوؤں کے سامنے بے بس ثابت ہوا۔ امریکی افواج اور خفیہ ایجنسیوں نے اربوں ڈالر جاسوسی پر خرچ کئے۔ طالبان لیڈر شپ کا سراغ لگانے کے لئے ان پر زر و جواہر کی بارش کر دی، ملا عمر کا ساتھ چھوڑنے والوں کو ہر قسم کی ترغیبیں دی گئیں لیکن ہر کوشش ناکام ٹھہری۔ ملا داداللہ کے سوا ایک بھی ممتاز طالبان رہنما ہلاک نہ ہو سکا۔ جو اکا دکا ان سے الگ ہوئے تھے وہ بھی بعد میں واپس آ گئے۔ باقیماندہ بھی طالبان قیادت کے خلاف بولنے کو تیار نہ ہوئے۔ اب نوبت یہاں تک آئی کہ خود امریکہ القاعدہ اور طالبان کو الگ الگ قرار دے کر ان سے مذاکرات میں مصروف ہے اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل تک القاعدہ اور طالبان کی تفریق کو منظوری دے چکی ہے، طالبان کو دہشت گرد تنظیموں کی فہرست سے نکالا جا چکا ہے۔ اب اور کس کو کہتے ہیں گھٹنے ٹیکنا۔ صدر اوبامہ نے افغانستان سے امریکی فوجیوں کے انخلا کا اعلان کیا تو ٹی وی پر اپنی قوم سے دس منٹ کے خطاب میں سب سے زیادہ جن دو باتوں پر زور دیا ان میں سے ایک یہ تھی کہ القاعدہ کی تمامتر کوششوں کے باوجود یہ جنگ اسلام بنام امریکہ نہیں بنائی

اکیسویں صدی کا پانی پت اور مکھیوں کی جنگ تسلسل

جا سکی۔ پتہ نہیں صدر ابامہ کے اس دعوے میں کتنی سچائی ہے لیکن جس طرح یہ ان کی نظر میں امریکی حکمت عملی کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے اسی طرح امریکہ کے اعصاب پر سوار یہ خوف کہ یہ جنگ اسلام اور امریکہ کی جنگ نہ بن جائے ایک بہت ہی تلخ حقیقت کی غماز ہے۔ دھواں وہیں اُٹھتا ہے جہاں آگ موجود ہوتی ہے۔ پانی پت میں لودی پر غالب آنے کے بعد بابر سلطنت دہلی کا تاجدار صرف اس لئے نہیں بن گیا تھا کہ اس کے پاس توپ اور بندوقیں تھیں، بے شک جدید ٹکنالوجی اس کی ایک بہت بڑی طاقت تھی لیکن اس کی اصل طاقت وہ مقامی حمایت تھی جو لودی خاندان کے حکمرانوں کے خلاف اسے حاصل تھی۔ افغانستان کی سرزمین میں اکیسویں صدی کے اس پانی پت نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ کوئی فوج چاہے کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو، خواہ اسے ٹکنالوجی کی جتنی سپورٹ حاصل ہو اور اس کے پاس جس قدر بھی وسائل ہوں، اس کے لئے عوامی حمایت رکھنے والی گوریلا تحریک کو شکست دینا ممکن نہیں۔ میں نے کسی موقع پر ان ہی کالموں میں رابرٹ لیبر کے حوالے سے لکھا تھا کہ یہ جنگ مکھیوں کی جنگ ہوتی ہے جس میں فتح طاقت و جسامت پر منحصر نہیں ہوتی۔ مکھی کتے کی دم پر بیٹھتی ہے وہ وہاں کاٹ کھاتا ہے، اڑ کر اس کی پیٹھ پر آ بیٹھتی ہے، وہ وہاں بھنبھورتا ہے، مکھی اس کے کان پر بیٹھ جاتی ہے، اس کے سر اور تھوتھنے پر آ بیٹھتی ہے۔ کتا کبھی یہاں کاٹتا ہے، کبھی وہاں کاٹتا ہے، کبھی اس پہلو اچھلتا ہے، کبھی اس پہلو تڑپتا ہے، وہ اپنے آپ سے عاجز آ جاتا ہے، اسے اپنی حالت پر رحم آنے لگتا ہے، ایسے کتے کو آپ نے بارہا سڑک پر بھاگتے دیکھا ہو گا اور آپ کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا کہ وہ سرپٹ بھاگ رہا ہے تو کیوں؟ جس دوسری بات پر صدر ابامہ نے اپنے خطاب میں اس سے بھی زیادہ زور دیا وہ یہ تھی کہ پچھلی ایک دہائی میں جنگوں پر اربوں ڈالر خرچ کئے گئے۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اپنی معاشی ترقی پر توجہ دیں۔ یہ اسی بے بسی کا اظہار ہے جو مکھی اور کتے کی جنگ میں فریق ثانی کا مقدر ہوتی ہے۔ طالبان کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے تاریخ کی ایک بہت ہی کامیاب گوریلا جنگ لڑی، چھوٹے چھوٹے زخم لگا کر دشمن کو بے حال کر دیا۔ پھر اس جنگ کو پھیلایا کبھی جنوبی افغانستان میں زور بڑھایا، کبھی مغربی افغانستان، کبھی کسی علاقے پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا تو کہیں حملہ کر کے فرار ہو جانے کی حکمت عملی اپنائی۔ طالبان کی اصل کامیابی اپنی قیادت کی اطاعت، وفاشعاری اور فرماں برداری میں ہے۔ ملا عمر برسوں سے غیر فعال اور روپوش ہیں، ان سے لوگ مل نہیں سکتے، ان کے زبانی یا ریکارڈ شدہ احکامات ہی کمانڈروں تک پہنچتے ہیں لیکن کیا مجال ہے کہ طالبان کے کسی ادنی سے ادنی سپاہی کی وفاداری پر حرف آ جائے، ہر جنگجو اپنے امیر کا وفادار رہا۔ یہ ان کا اٹوٹ کمٹمنٹ ہی ہے کہ اگر انہوں نے ماضی کی غلطیاں نہ دوہرائیں تو بقول شخصے طالبان آج اپنی فتح سے دو قدم کے فاصلے پر ہیں۔ عراق میں امریکہ اور القاعدہ نے مزاحمت کاروں کو نسلی، قومی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم کر دیا، شیعہ سنی فسادات ہوئے، کردوں کو مشتعل کیا گیا، بغداد میں خودکش حملے ہوئے، عام شہریوں کو بم دھماکوں کا نشانہ بنایا گیا، درگاہوں اور مزارات کو بموں سے اڑایا گیا جس کا شدید ردعمل ہوا۔ وہ جب اقتدار میں تھے تو خواہ کچھ کرتے ہوں لیکن طالبان نے ماضی کی غلطیوں سے سبق لے کر یہ غلطی اب نہیں دوہرائی۔ وہ تاجک اور ازبک قیادت کو نشانہ بنا سکتے تھے مگر اس سے گریز کیا، کابل میں دھماکے نہیں کرائے۔ شدید اختلافات کے باوجود ہزارہ قیادت کو بھی نشانہ نہیں بنایا۔ ان کی اس حکمت عملی اور آپسی اتحاد واطاعت کی طاقت نے سپر پاور کو ان کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ میری ذاتی رائے ہے کہ ان کی اس کامیابی کا سہرا ان نادیدہ مہربانوں کے سر بھی جاتا ہے جن کی مدد اور چشم پوشی کے بغیر وہ یہ جنگ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ آنے والا زمانہ ان نادیدہ طاقتوں اور سربستہ رازوں کو بھی ایک دن ضرور دنیا کے سامنے کر دے گا۔ اس وقت ہماری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں ان میں امریکہ کے لئے بھی عبرت ہے اور دنیا کے لئے بھی سبق۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

فکرِ فردا

فریدون، ضحاک اور نگمانند

احمد جاوید

2025 / 06 / 18



مضمون کی ویب اشاعت سے

ہر دوار سے سوامی نگمانند کی موت کی خبر آئی تو میرا ردعمل اوروں سے مختلف تھا۔ کوئی اس پر غم واندوہ کا اظہار کر رہا تھا کہ اس جواں سال سادھو نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی لیکن ارباب اقتدار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی جبکہ وہ کچھ اور نہیں گنگا کو آلودگی سے بچانے اور غیر قانونی کھدائی کی مانگ کر رہا تھا تو کوئی اس کی بھوک ہڑتال کا موازنہ یوگا گرو بابا رام دیو کے ستیا گرہ سے کر رہا تھا جو اس وقت اسی اسپتال کی انتہائی نگہداشت یونٹ میں موجود تھے اور سیاستدانوں سے لے کر افسروں اور سادھو سنتوں سے لے کر سماجی رہنماؤں تک میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی، بڑے نامی گرامی سادھو سنت اور سیاسی وغیر سیاسی رہنما ان کی بھوک ہڑتال توڑوانے کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ اور کوئی بی جے پی کے دوہرے پیمانے، آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کے کھوکھلے کردار کو ہدف تنقید بنا رہا تھا۔ اس کے برعکس میں نہ رو سکتا تھا نہ ہنسنے کی طاقت تھی، نہ کچھ بولنے کی ہمت نہ سننے کا حوصلہ، فکر و تشوش کا ایک گہرا سمندر تھا اور میں۔ پھر اس جواں سال سادھو کی مرگ ناگہاں پر اس کے بڑے بھائی انجینئر ستیم کمار آشیش کا ردعمل میڈیا کی سرخیوں میں آیا تو میری یہ کیفیت اور بھی شدید ہو گئی جس کو بہ کوشش تمام ابھی تک میں کوئی نام نہیں دے سکا۔ نگمانند کی داستان حیات بھی ایک بہت ہی دردناک کہانی ہے۔ وہ شمالی بہار کے ایک متوسط میتھل برہمن خانوادے کا چشم وچراغ تھا۔ جہاں اس قسم کے سادھو سنت بننے کی کوئی روایت نہیں ہے۔ میتھل برہمن تارک الدنیا سنیاسی یا گوشہ گیر سادھو سنت نہیں ہوتے، ان کی زندگی متوازن اور شاستروں میں آئے چاروں آشرم (برہم چریہ، وان پرست، گرہست اور سنیاس) کا سنجوگ اور متوازن ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے آخری حصے میں جب انسان گھر گرہستی کی ذمہ داریوں سے فارغ اور بال بچوں پر منحصر ہو جاتا ہے، دنیا کے جھمیلوں سے الگ ہو کر خود کو اپنے چھوٹوں کی رہنمائی اور پوجا پاٹھ کے لئے وقف کر دیں تب بھی گھر اور خاندان کو نہیں چھوڑتے۔ وہ روایتی طور پر شاستروں کے ماہر ہوتے ہیں، ویاکرن، ریاضی، کھگول اور جیوتش جیسے علوم ان میں سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں، وہ پنڈت ہیں، گیانی ہیں اس لئے وقت کی رفتار سے ہم آہنگی ان کی خاصیت ہے، جتنے ڈاکٹر، انجینئر، اور آئی اے ایس، آئی پی ایس افسران آج ان میں ہیں ہندوستان کے کسی بھی خطے کی کسی اور برادری میں نہیں ہیں۔ ان میں سے چند افراد پوجا پاٹھ اور مذہبی رسومات کی پیشوائی کی ذمہ داری ضرور ادا کرتے ہیں، پیدائش سے موت تک کے مذہبی امور ادا کرانے، زائچہ بنانے، مہورت نکالنے وغیرہ کیلئے وہ اپنے ججمانوں سے معقول دکشنا وصول کرتے ہیں، ان کے ایسے ہر کام کا معاوضہ اسی طرح مقرر ہے جس طرح ڈاکٹروں اور وکیلوں کی فیس مقرر ہوتی ہے لیکن وہ چوبیسوں گھنٹے اسی میں

فریدون، ضحاک اور نگمانند تسلسل

نہیں لگے رہتے، گھر گرہستی کے سارے کام اسی طرح وقت پر انجام دیتے ہیں جس طرح کوئی ڈاکٹر یا وکیل کرتا ہے۔ان میں کوئی گیرو البادے میں ملبوس بھکاری یا مندروں میں دھونی رما کر بیٹھا سادھو نہیں ہوتا۔یہ رجحان ان میں پہلے تھا نہ اب ہے۔ان میں ودیاپتی اور منڈن مشرا جیسے عظیم بھگت اور پنڈت ہوئے ہیں لیکن نہ تو وہ سنیاسی تھے نہ فقیر۔ان کی بیویاں اور بچے بھی ان ہی کی طرح پنڈت گیانی تھے۔نگمانند کا اصل نام سوروپ کمار گریش تھا۔اس کی پیدائش دربھنگہ کے ایک گاؤں میں غالباً 1976 میں ہوئی۔اس کے والد پرکاش کمار جھا انجینئر اور ایک اعلیٰ عہدیدار ہیں۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ رانچی میں رہتے ہیں۔ گریش ان کے دو بیٹوں میں چھوٹا اور والدین کا بے حد عزیز تھا، وہ ذہین اور ہونہار تھا۔اس نے بہترین مارکس کے ساتھ میٹرک پاس کیا اور اعلی تعلیم کے لئے دہلی آیا جہاں وہ گرین فیلڈ اسکول کا طالب علم تھا۔وہ آئی آئی ٹی کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک لاپتہ ہو گیا۔دادا دادی، والدین، چچا اور بھائی بہنوں کا اضطراب مت پوچھیئے۔اس سے عمر میں دو سال بڑے بھائی آشیش نے کہاں کہاں کی خاک نہ چھانی لیکن کچھ پتہ نہیں چلا، انجینئر آشیش جو بنگلور کی کسی کمپیوٹر کمپنی میں ملازم ہیں بتاتے ہیں کہ جب انہیں پتہ چلا کہ ان کا گریش ہردوار کے میتری سدن میں ہے وہ وہاں بھی پہنچے لیکن آشرم کے سوامی شیوانند نے ایسے کسی بھی شخص کے آشرم میں ہونے سے صاف صاف انکار کر دیا اور جب ان کا بھائی ایک سنیاسی کی شکل میں سوامی شیوانند کے چیلے کی حیثیت سے سامنے آیا تو وقت بہت آگے نکل چکا اور اس کی واپسی ناممکن ہو چکی تھی۔سوامی شیوانند کے سایے میں روحانیت کی مشق وریاضت کرتے کرتے نگمانند (سوروپ کمار گریش) کو گنگا کی فکر ستانے لگی۔ دراصل سادھو سنتوں کی کوششوں سے حکومت اتراکھنڈ نے 26 مارچ 2010 کو کنبھ میلہ کے جائے انعقاد میں کھدائی پر مکمل پابندی عاید کر دی تھی لیکن اس خطے میں مائننگ کرنے والوں کی عرضی پر نینی تال ہائی کورٹ نے 27 دسمبر 2010 کو سرکار کے اس حکم پر روک لگادی۔ماتری سدن نے اس روک کو نامنظور کرتے ہوئے تحریک چھیڑ دی۔اس کا الزام تھا کہ یہ فیصلہ پتھروں اور ریت کی کھدائی کرنے والے مافیا سے ساز باز کا نتیجہ ہے اور فیصلہ سنانے والا جج پی ایف گھوٹالے میں ملوث رہ چکا ہے۔ عدالت میں قانونی جنگ جاری رکھنے کے ساتھ ہی 28 جنوری 2011 سے ماتری سدن کے سوامی یجنانند بھوک ہڑتال پر بیٹھے لیکن ان کی طبیعت بگڑ جانے کے بعد 19 فروری سے نگمانند تامرگ بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔وہ اس سے قبل 2007 میں 7 دن اور 2008 میں بھی 68 دن بھوک ہڑتال کر چکے تھے۔58 دنوں کے بعد ان کی طبیعت بگڑی تو پولس نے اٹھا کر ان کو ضلع اسپتال میں بھرتی کرایا جہاں سے پہلے دہرادون لے جایا گیا۔پھر جولی گرانٹ اسپتال میں بھرتی کرایا گیا۔یہیں ان کی موت ہوئی۔ جس وقت کے ملک کچھ نامی گرامی سادھو سنت اور سیاستداں بابا رام دیو کی بھوک ہڑتال ختم کرانے کے لئے دہرادون کے ہمالین اسپتال کے چکر لگا رہے تھے عین اسی وقت دوسری طرف ایک جواں سال سنیاسی بے ہوشی کی حالت میں آخری سانسیں لے رہا تھا لیکن اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی۔ انجینئر آشیش کہہ رہا تھا کہ ”اس کا بھائی میتری سدن کے سوامی شیوانند اور پتھروں کی کھدائی کرنے والے مقامی ٹھیکیداروں کی آپسی دشمنی کا شکار ہو گیا۔ اپریل کے آخری ہفتے میں اس سے میری بات ہوئی تھی، فون پر اس نے بتایا تھا کہ وہ تو بھوک ہڑتال توڑ دینا چاہتا ہے لیکن سوامی شیوانند جی اسے اس کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔وہ 16 فروری سے انشن پر تھا۔اس سے پہلے کہ ہم کچھ کرتے، اس کی زندگی ہاتھ سے نکل چکی تھی اور 27 اپریل کو اسے اسپتال میں داخل کرادیا گیا تھا“ اس وقت میرے ذہن میں تاریخ کے کئی اوراق گردش کر رہے تھے۔ انجینئر پرکاش کمار جھا، سوامی شیوانند جی مہاراج اور سوروپ کمار گریش (سوامی نگمانند) میں مجھے تاریخ انسانی کے بہت سے کردار نظر آرہے تھے، وہ آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور میں فکر و تشویش کے ایک بحر بے کنار میں غرق تھا۔کارل مارکس نے یقیناً اسی دن کے لئے مذہب کو افیون کی گولی کہا تھا اور غالب نے جنت کی حقیقت کو اسی پس منظر میں اپنے تلخ و تند طنز کا موضوع بنایا ہوگا۔آریہ نسل کے لوگوں کی قدیم سرزمین فارس کی تاریخ کا ایک اساطیری

فریدون، ضحاک اور نگمانند تسلسل

کردار ضحاک بہت مشہور ہے۔ وہ توران کے بادشاہ کا بیٹا اور شہنشاہ جمشید کا باجگذار تھا جس کی سلطنت کا ایک عالم میں طوطی بولتا تھا، جمشید اور فریدون کے دشمن جب کسی بھی طرح اسے زیر نہ کر سکے تو ایک سن رسیدہ جادو گر یا شیطان نے عابد وزاہد کا روپ اختیار کر کے شاہ توران کے دربار میں رسائی حاصل کی، پھر وہ اسکے بیٹے اور متوقع جانشین ضحاک کا اتالیق بن بیٹھا۔ یہاں تک کہ اس نے ضحاک کے ہاتھوں پہلے اس کے باپ اور پھر شہنشاہ جمشید کے جانشین فریدون کا قتل کرادیا۔ ضحاک کے بادشاہ بن جانے کے بعد اس نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرے یا بوسہ دیا جس سے اس کے دونوں کندھے پر دو سانپ نمودار ہوئے جو نوجوانوں کا مغز کھاتے تھے، ہر دن دو خوبرو نوجوان لائے جاتے ان کو قتل کیا جاتا اور ان کے مغز سے ضحاک کے شانوں پر پھنکارتے سانپوں کے پیٹ کی آگ بجھائی جاتی۔ یہاں تک کہ وہ سانپ بستی کی بستی اور قوم کی قوم کے نوجوانوں کا مغز کھاتے چلے گئے۔ قصہ طویل ہے اور مختلف انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس اساطیری کہانی کی اصل حقیقت کیا ہے اور ان میں سے کونسی روایت زیادہ درست ہے لیکن ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آج کے ضحاک کے سانپ بھی نوجوانوں کا مغز کھاتے ہیں اور تب تو ایک ضحاک تھا، آج انگنت ضحاک نہ جانے کس کس بھیس میں سرگرم ہیں۔ آپ کو میری یہ بات ذرا تلخ لگے گئی لیکن یہ سچ ہے کہ سوامی اسیمانند اور سوامی شیوانند کی شکل میں ہی نہیں، مرشدوں، پیروں اور نام نہاد مولانائوں کی شکل میں بھی کتنے ضحاک ہیں جن کے شانوں پر لہراتے افعٰی کی خوراک کچے ذہن کے نوجوانوں کا مغز ہے، بہت سے حسن بن صباح آج بھی موجود ہیں جو نوجوانوں سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین رہے ہیں، انہیں اپنا ذہنی غلام بنا رہے ہیں، موت کے منہ میں جاتے ہوئے بھی سوامی اسیما نند کا سورگ یا حسن بن صباح کی جنت انہیں زندگی جیسی خدا کی عظیم نعمت وامانت کے بارے میں سوچنے نہیں دیتی۔ وہ یہ سوچ کر خود کو ہلاکت میں ڈال لیتے ہیں کہ حضرت کا حکم ہے یا سوامی جی کا آدیش ہے کیا کریں؟ کاش! ہم اپنے عہد کے ضحاک کو پہچان پاتے اور ان کو اسی طرح ختم کر سکتے جس طرح ضحاک کے ظلم سے سلطنت ایران کو نجات ملی تھی۔

اسی تحریر سے

ہر دوار سے سوامی نگمانند کی موت کی خبر آئی تو میرا ردعمل اوروں سے مختلف تھا۔ کوئی اس پر غم واندوہ کا اظہار کر رہا تھا کہ اس جواں سال سادھو نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی لیکن ارباب اقتدار کے...

فکرِ فردا

ہندوستانی مسلمان اور حق تعلیم مستثنیٰ منہ



احمد جاوید

2025 / 06 / 18

احمد جاوید مسلم پرسنل بورڈ کی مجلس عاملہ نے حق تعلیم ایکٹ (آر ٹی ای) سے مدرسوں کو مستثنیٰ قرار دینے کی مانگ کی اور پھر اس قانون میں ترمیم کے لئے تحریک چھیڑنے کا اعلان کیا تو حیرت نہیں ہوئی کہ ملک کے مسلمانوں کے مختلف مسالک و مکاتب فکر کے دینی رہنماؤں کی یہ انجمن جس کا واحد ایجنڈا شریعت کا تحفظ ہے حق تعلیم ایکٹ میں شریعت کے لئے خطرہ دیکھتی ہے اور اس ایکٹ کے نفاذ کے تقریباً ایک سال بعد قائدین ملت میں یہ بیداری آئی ہے، حیرت تو اس پر ہے کہ ہندوستان کے آئین و قانون پر گہری نظر اور اقلیتوں کے مسائل کا گہرا ادراک رکھنے والے مسلم دانشوروں پر خاموشی طاری ہے۔ جو قانون ملک کے ہر شہری کو معیاری تعلیم کی گارنٹی دیتا ہے اور جس کو عام طور پر غریبوں، کمزوروں اور اقلیتوں کے لئے وردان مانا جارہا ہے اسے یہ علماء مذہبی آزادی کے بنیادی حق کے منافی اور تعلیم کو قومیانے کی سازش قرار دے رہے ہیں۔ اب ایک سال ہونے کو آئے، دہلی کی اردو اکادمی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ملک کے معروف ماہر تعلیم و سرکردہ دانشور سید حامد (چانسلر، جامعہ ہمدرد) کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا تھا۔ جلسے کی صدارت جسٹس راجندر سچر کر رہے تھے۔ اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے ایک بڑا ہی دلچسپ واقعہ بیان کیا تھا۔ جسٹس سچر جو ایک ماہر قانون و انصاف کے علاوہ سرکردہ سماجی خدمت گار بھی ہیں بلکہ یہ ان کی شخصیت کا غالب عنصر ہے، وہ سماج کے دبے کچلے اور پسماندہ طبقات کے لیے اپنے دل میں بے پناہ درد رکھتے ہیں اس لیے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے سلسلے میں سید حامد کی کوششوں کے قدر داں ہیں۔ مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لیے وزیر اعظم ہند کے ذریعے جسٹس راجندر سچر کی صدارت میں مقرر کی گئی اعلیٰ سطحی کمیٹی میں سید حامد بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے بڑی محنت اور ایمانداری سے ملک کے مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی حالت کا مطالعہ کیا، اس کے لیے سرکاری و غیر سرکاری ایجنسیوں سے ٹھوس اعداد و شمار حاصل کیے، ملک کے مختلف علاقوں کے دورے کیے، ماہرین اور دانشوروں سے تبادلۂ خیالات کیا اور سماجی و سیاسی نمائندوں سے ملاقاتیں کیں۔ اسی سلسلے میں یہ تحقیقاتی کمیٹی حیدر آباد گئی تھی۔ جسٹس سچر کا بیان ہے کہ اس دن شہر کے مسلمانوں کے ایک نمائندہ وفد سے ان کی ملاقات تھی۔ یہ بڑے ہوش مند، تعلیم یافتہ اور آج کی دنیا پر گہری نگاہ رکھنے والے مسلمان تھے۔ انہوں نے کمیٹی کے سامنے اپنی باتیں بڑی خوش اسلوبی سے رکھیں لیکن ایک موقع پر سید حامد صاحب ان پر چیخنے لگے، وہ انتہائی غصے میں تھے، جتنا جی میں آیا ان کو برا بھلا کہا۔ ہم سب حیران تھے لیکن ان کے اس غصے کا سبب ناقابل فہم نہیں تھا۔ وہ ایک درد مند دل رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے سچے ہمدرد ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ اس وفد میں شامل بعض افراد نے سچر کمیٹی سے کہا کہ چونکہ عام طور پر مسلم طلبہ میٹرک کے امتحانات میں ریاضی میں ناکام ہو جاتے ہیں اور ان کی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھنے سے رک جاتا ہے اس لیے سچر کمیٹی حکومت سے یہ سفارش کرے کہ مسلم طلبا کو اس سلسلے میں مستثنیٰ قرار دے دیا جائے، ان کے لیے ریاضی (حساب) میں پاس ہونا لازمی نہ ہو۔ یہ سننا تھا کہ سید حامد اپنے غصہ پر قابو نہ رکھ سکے۔ چیخ اٹھے 'کیا آپ لوگ اس قوم کو جاہل بنا دینا چاہتے ہیں؟' پھر دیر تک ان پر لعنت ملامت کرتے رہے اور ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ تقریباً ایک سال سے دہلی اور ملک کے مسلم سیاسی و سماجی حلقوں میں وقفہ وقفہ سے مفت لازمی تعلیم کے قانون کے خلاف آوازیں اٹھائی جارہی ہیں، جمعیۃ علماء ہند، ملی کونسل، مجلس مشاورت، مسلمانوں کی کون سی قابل ذکر تنظیم ہے جو حق تعلیم ایکٹ یا اس کی بعض دفعات سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دینے کا مطالبہ نہیں کر رہی ہے

ہندوستانی مسلمان اور حق تعلیم مستثنیٰ منہ تسلسل

، یہاں تک کہ اب مسلم پرسنل لا بورڈ نے بھی مورچہ سنبھال لیا ہے۔ یہ تنظیمیں حکومت کو دھمکی دے رہی ہیں کہ اس نے اگر مسلمانوں کے دینی مدارس کو اس قانون سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا تو وہ اس کے خلاف ملک گیر تحریک چھیڑیں گے۔ لاکھوں کی تعداد میں سڑکوں پر اتریں گے، گرفتاریاں دیں گے، جیل بھریں گے کیونکہ یہ پچھلے دروازے سے تعلیم کو قومیانے کی سازش ہے، اس قانون کی زد میں ہمارے دینی مدارس آتے ہیں جن پر حرف آئے ہمارے لیے کسی بھی قیمت پر قابل برداشت نہیں ہے۔ حیدر آباد میں مسلمانوں کے نمائندہ وفد نے سچر کمیٹی سے مسلم طلبہ کے لیے جس استثنیٰ کا مطالبہ کیا تھا، گہرائی میں اتر کر دیکھیں تو حق تعلیم ایکٹ کے سلسلے میں مسلم علماء و ملی قائدین کے مطالبات اس سے ذرا بھی مختلف نہیں ہیں لیکن آج کسی سید حامد کو ان پر غصہ نہیں آرہا ہے (اور اگر آرہا ہو تو ہمارے علم میں نہیں ہے) کسی نے ان کو ڈانٹ نہیں پلائی، کسی کی ہمت نہیں کہ لب کشائی کرے کیونکہ آج ان کے سامنے حیدر آباد کے ہوش مند اور تعلیم یافتہ مسلمان نہیں بلکہ شمالی ہند کے قائدین ملت اور علمائے کرام ہیں۔ ہر سمجھ دار آدمی خوفزدہ ہے کہ کہیں اس پر حکومت کی حمایت اور ملت سے غداری کا الزام نہ آجائے۔ پہلا سوال تو یہی ہے کہ جب یہ قانون پارلیمنٹ کی میز پر تھا اور اس پر بحث ہو رہی تھی، اس وقت ہمارے قائدین کہاں سو رہے تھے؟ اور جب اس قانون کے نفاذ کو چار ماہ سے اوپر ہو گئے، ان میں اچانک بیداری اور بے چینی کیوں پھیل گئی اور اب ایک سال بعد مسلم پرسنل لا بورڈ نے حق تعلیم ایکٹ کے خلاف نئی توانائی کے ساتھ جنگ کیوں چھیڑ دی ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اس قانون سے مسلمانوں اور بالخصوص مدرسوں کو مستثنیٰ قرار دیا جانا ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو اس کی کیا صورت ہو گی؟ کیا حکومت کو یہ اختیار ہے کہ ملک کے بعض شہریوں کو آئین میں دیے گئے حقوق دے اور بعض کو اس سے کسی وجہ سے محروم رکھے؟ اور اگر ایسا کیا گیا تو کیا یہ ملک کے آئین کی روح اور انصاف کے تقاضے کے منافی نہیں ہو گا؟ اگر ہاں تو پھر اس آئینی و قانونی بحران کا حل کیا ہے؟ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس قانون میں کوئی خامی نہیں ہے لیکن حق تعلیم ایکٹ کو جبری تعلیم یا تعلیم کو قومیانے کی سازش قرار دے کر ٹکراؤ کا ماحول پیدا کرنا سراسر غلط، گمراہ کن اور بدبختانہ ہے۔ یہ نہ ملک و قوم کے حق میں بہتر ہو گا اور نہ مسلمانوں کے حق میں بہتر۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ ہم اس قانون ے ہر پہلو پر ہم سنجیدگی سے غور کرتے اور منفی طرز فکر ترک کر کے حق تعلیم ایکٹ ہمیں جو حقوق دیتا ہے، اس سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی تدابیر کرتے لیکن ہو رہا ہے یہ کہ ہم اندیشوں اور امکانات کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، حکومت کی نیت پر شک کر رہے ہیں، ان شرائط کو منفی طور پر لے رہے ہیں جو تعلیمی اداروں پر ملک کے ہر شہری کو یکساں اور معیاری تعلیم کی سہولیات مہیا کرنے کی غرض سے عائد کی گئی ہیں۔ جب حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم کے جملے مصارف برداشت کرے اور آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ معیاری تعلیم کی سہولیات مہیا کرانے سے قاصر رہنے کی صورت میں اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں تو اس قانون میں جو کم از کم معیار طے کیا گیا ہے وہ ہمارا حق ہے یا حکومت کی جانب سے تھوپی گئی شرطیں؟ یہ آپ کے نقطۂ نظر پر منحصر ہے کہ آپ ان کو کس طرح لیتے ہیں۔ دراصل ہم لوگ آسانیوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور اپنے بچوں کے لیے بہتر اور معیاری تعلیم کے حصول کی تدابیر اور اپنے اداروں کو حکومت سے تعلیمی اداروں کی حیثیت سے تسلیم کرانے کی جدوجہد کرنا یقیناً مشکل کام ہے۔ شاید اسی لیے قائدین ملت شرائط میں نرمی بلکہ استثنیٰ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس میں آسانی یہ بھی ہے کہ لگے ہاتھوں سیاست کی روٹی بھی گرم ہو رہی ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنے حق سے خود ہی دست بردار ہونے کی ضد کریں، خود کو مستثنیٰ منہ کرانے کا مطالبہ کریں اور اپنے اداروں کو تسلیم کرانے کی جدوجہد نہ کریں۔ کسی طفل مکتب کو بھی یہ بتانے کی حاجت نہیں ہے کہ حق تعلیم ایکٹ سے کسی فرد، جماعت یا ادارہ کو مستثنیٰ قرار دینے کا مطلب اس کو ان حقوق سے محروم یا دست بردار کرنا ہے جو یہ ایکٹ اسے دیتا ہے۔ پچھلے سال جولائی میں اس سلسلے کے ایک جلسے میں مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل نے مدرسوں کو اس ایکٹ سے مستثنیٰ کرانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ پھر انہوں نے ایک گائڈ لائن جاری کیا۔ ان کا کہنا ہے

ہندوستانی مسلمان اور حق تعلیم مستثنیٰ منہ تسلسل

کہ ”حق تعلیم ایکٹ میں مدرسہ کی بات نہیں ہے اور نہ ہی اس سے مذہبی تعلیم کو کوئی خطرہ لاحق ہے۔ پھر بھی اگر کسی کو شک ہے تو اس کے لیے گائڈ لائن جاری کر دیا گیا ہے۔“ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس قانون سے مذہبی تعلیم کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے لیکن جو تعلیمی ادارے ضروری شرائط پورے نہیں کرتے، وہ اس قانون کی زد میں ضرور آئیں گے چاہے وہ اسکول یا پاٹھ شالا ہوں یا مدرسے۔ اس ایکٹ کی رو سے غیر منظور شدہ اداروں میں بچوں کو روکنا غیر قانونی اور قابل مواخذہ جرم ہوگا۔ گائڈ لائن وغیرہ وقتی اور جھوٹی تسلی ہے۔ وزیر موصوف یہ کہہ کر جھوٹی تسلی دے رہے ہیں کہ مدرسے اس قانون کے دائرے میں نہیں آتے۔ کیونکہ اگر مدرسوں کو مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے تو یہ مدرسوں میں زیر تعلیم بچوں کے بنیادی حق کے ساتھ سمجھوتہ اور خلاف آئین ہوگا۔ آخر ان بچوں کو وہ کس جرم میں تعلیم کے حق سے محروم کر سکتے ہیں جو تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی لینا چاہتے ہیں؟ حکومت پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کو طفل تسلی دینے یا گمراہ کرنے کے بجائے ہمارے دینی مدرسوں کو تعلیمی اداروں کی حیثیت سے تسلیم کرے اور مدرسے بھی تعلیم کے کم از کم معیار کی پابندی کریں اور خود کو تسلیم کرائیں۔ حکومت سے تسلیم شدہ ایسے مدرسے اس ملک میں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں اور شاید کپل سبل ان ہی مدرسوں کے تعلق سے بار بار کہہ رہے ہیں کہ مدرسے اس قانون کی زد میں نہیں آتے۔ مسلمانوں کو کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہئے۔ ماضی میں بھی یہ ملت اس قسم کی طفل تسلیوں کا شکار ہو چکی ہے۔ حق تعلیم ایکٹ ملک کے ہر بچے (6 تا 14 سال عمر) کو یہ ضمانت دیتا ہے کہ اس کو معیاری تعلیم کی سہولیات مہیا کرائی جائے۔ اس قانون کا اصل مقصد و منشا یہی ہے اور اسی کو یقینی بنانے کے لیے اس ایکٹ میں قانونی انتظامات کیے گئے ہیں۔ کسی بھی قانون کی الگ الگ دفعات کو اس کی منشا اور سیاق و سباق سے ہٹا کر اندیشہ ہائے دور دراز کا بازار گرم کیا جا سکتا ہے اور اس قانون کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ جو لوگ اس قانون کو آئین کی دفعہ 29 اور 30 سے متصادم بتا رہے ہیں وہ بھول رہے ہیں کہ دفعہ 30 آئین میں ہر شہری کو دیے گئے بنیادی حقوق کی تشریح ہے اور ملک میں رائج و نافذ العمل جملہ قوانین اس کے تابع ہیں کوئی قانون اس سے متصادم نہیں ہو سکتا۔ حق تعلیم ایکٹ میں جہاں یہ بندوبست ہے کہ بچے کی تعلیم کی راہ میں آنے والے والدین اور سرپرستوں کے خلاف کارروائی کی جائے گی، ان کو قید اور جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے وہیں یہ ضمانت بھی موجود ہے کہ بچوں کو اس کی اور اس کے والدین / سرپرست کی پسند کے ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کا حق ہوگا۔ لیکن وہ ادارے طے شدہ معیار کے پابند ہوں گے۔ یہ نہ ہو کہ تعلیم کے نام پر کاٹھ کی ہانڈی چڑھا رکھی ہو۔ ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا میں آج تعلیم کا جو عمومی معیار ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ بچوں کو پرائمری اور اپر پرائمری (تحتانی و وسطانی) درجات میں ان کی مادری زبان میں سائنس، ریاضی اور سماجیات کی تعلیم دی جاتی ہے، ان کے علاوہ بچہ کوئی اور زبان پڑھنا چاہے یا ملک کی قومی زبان اس کی مادری زبان کے علاوہ ہو تو اس زبان کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اگر آپ قوم کے بچوں کو اتنی تعلیم بھی دینا نہیں چاہتے (خواہ وہ مدرسے کے بچے ہی کیوں نہ ہوں) یا اس کو بھی بوجھ تصور کرتے ہیں تو کیا آج کی دنیا میں یہ خودکشی نہیں ہے؟ جب ہر بچے کی تعلیم کے مصارف اٹھانے کی حکومت پابند ہے اور وہ بھی بچے کے پسند کے تعلیمی ادارے میں تو کیا کسی بچے کو اس حق سے محروم رکھنا یا مستثنیٰ منہ قرار دینا اس کے ساتھ ظلم نہیں ہوگا؟ اگر آپ اپنے تعلیمی اداروں کو معیاری بنانے کے بجائے معیار میں چھوٹ اور استثنیٰ کے طلب گار ہیں تو اس کا مطلب کیا سمجھا جائے؟ ہمارے بچے ریاضی میں ناکام ہو جاتے ہیں اس لیے ریاضی کو استثنیٰ قرار دے دیا جائے، یہ سوچ آخر کس حقیقت کا ثبوت ہے؟ آخر آپ قوم کو جاہل رکھنے پر کیوں بہ ضد ہیں؟ افسوس تو یہ ہے کہ ہماری حکومتیں سر وہ کام کرنے کو تیار رہتی ہیں جس میں کوئی لاگت نہ آئے اور مسلمان خوش ہو جائیں یا برسر اقتدار پارٹی کا ووٹ بینک مظبوط ہو جائے چاہے ملک کو اس کی کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔

فکرِ فردا

راہل، انا اور میں



احمد جاوید 2025 / 06 / 18

انا کا موازنہ گاندھی اور جے پی کی بجائے ونوبا بھاوے سے کیا جانا زیادہ مناسب ہے جن کی بھودان تحریک نے کانگریس کے سنڈیکیٹ کے مقابلے انڈیکیٹ کی زمین تیار کی تھی

فکر فردا میں نہیں چاہتا کہ انا ہزارے آج کے جے پرکاش نارائن بنیں اور انکی تحریک سے فرقہ پرست عناصر کوئی فائدہ اٹھائیں، میری خواہش تھی کہ راہل گاندھی 'سنڈیکیٹ' کی گرفت سے باہر آئیں اور وہ ملک کے عوام کے دلوں کی دھڑکن بن جائیں۔ اور یہ اس کے لیے ایک سنہری موقع تھا جو کانگریس نے گنوا دیا۔

آحمد جاوید اس دن راہل گاندھی پارلیمنٹ میں وقفہء صفر کے دوران کھڑے ہوئے تو میرے دل نے کہا کہ وہ وہی کریں گے جو آج سے بیالیس سال پہلے ان کی دادی نے کیا تھا، جی چاہتا تھا کہ کانگریس کے لیڈروں اور ممبران پارلیمنٹ سے راہل بھی وہی کہیں جو ۱۹۶۹ء کے اگست میں ان سے اندرا گاندھی نے کہا تھا۔ لیکن آرزو تو پھر آرزو ہے، اتنی آسانی سے کب پوری ہوتی ہے۔ یہ پارلیمنٹ میں راہل کی پہلی باضابطہ تقریر تھی۔ وہ اس کے ساتھ انا ہزارے کی بھوک ہڑتال اور لوک جن پال بل پر اپنی خاموشی توڑ رہے تھے۔ یہ ان کے لیے اس تحریک پر اپنا موقف پیش کر کے ملک کے عوام کا دل جیت لینے کا ایک بہترین موقع تھا جس نے پورے دیس کو بے چین کر رکھا ہے، پارلیمنٹ ہی نہیں پورا ملک ہمہ تن گوش تھا اور وہ اس موقع کا استعمال کرنا چاہتے تھے۔ آج ان کے ساتھ ان کی بہن پرینکا بھی آئی تھیں جو عام طور پر پارلیمنٹ کے کسی اجلاس میں اس طرح نہیں آتیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پوری تیاری سے آئے تھے۔ وہ پالیمنٹ میں بولے اور خوب بولے، محنت سے تیار کی گئی ان کی اس تقریر نے لوگوں کو متاثر بھی کیا، تالیاں بھی بجیں، حزب اختلاف نے ہنگامہ بھی کیا اور اب اس پر باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ لیکن راہل گاندھی نے مجھے مایوس کیا ہے۔ ذاتی طور پر راہل گاندھی کی شخصیت نے مجھے کبھی متاثر نہیں کیا۔ مجھے ان میں ملک کے ایک سب سے بڑے سیاسی خاندان کا چشم وچراغ ہونے کے علاوہ کوئی خوبی نظر نہیں آتی جو ان کو ملک کے وزیر اعظم کی کرسی کا مضبوط امیدوار بناتی ہو لیکن پھر بھی میں انا ہزارے کے بجائے راہل گاندھی کو ملک کے عوام بالخصوص نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ انا ہزارے آج کے جے پرکاش نارائن بنیں اور انکی تحریک سے فرقہ پرست عناصر کوئی فائدہ اٹھائیں، میری خواہش تھی کہ راہل گاندھی 'سنڈیکیٹ' سے باہر آئیں اور وہ ملک کے عوام کے دلوں کی دھڑکن بن جائیں اور یہ اس کے لیے ایک سنہری موقع تھا جو کانگریس نے گنوا دیا۔ ارہل کی طرح اندرا گاندھی بھی اپنے والد پنڈت نہرو کی سیاسی وارث تھیں۔ لال بہادر شاستری کی اچانک موت کے بعد ان کو ملک کا وزیر اعظم بنوانے میں کامراج اور انکے ساتھیوں کا بڑا اہم رول تھا۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین کی موت کے بعد صدر جمہوریہ کے انتخاب میں کانگریس کے امیدوار کے بجائے وی وی گری کی حمایت کر کے وہ نہ صرف پارٹی کے اندر ایک طاقتور لیڈر بن کر ابھری تھیں بلکہ ملک کے عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئی تھیں۔ اندرا گاندھی نے پارٹی کے فیصلے

راہل، انا اور یہیں تسلسل

کے خلاف صدر جمہوریہ کے انتخاب میں پارٹی کے ممبران پارلیمنٹ و اسمبلی سے ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کی اپیل کی تھی۔ بہ غور دیکھیں تو آج ممبران پالیمنٹ پر اس سے کہیں زیادہ واجب ولازم ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز سنیں اور اسی کے مطابق فیصلہ لیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے ضمیر کو بیدار کرے تو کون؟ یہ راہل کر سکتے تھے لیکن وہ چوک گئے۔ کانگریس میں آج بھی وہی حالات ہیں جو ۱۹۶۹ء میں تھے۔ آج بھی کانگریس کو 'سنڈیکیٹ' چلا رہا ہے، جس نے اپنی ناسمجھی سے ملک میں ٹکراؤ کا ماحول پیدا کر دیا ہے، کرپشن جیسے مسئلے پر ملک کے عوام اور پالیمنٹ کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ انا نے زمیں ہموار کر دی تھی، راہل چاہتے تو اس سے ملک کو نکال سکتے تھے، ملک کے عوام ان کو امید کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ ان کو ایک قابل اعتماد، پر عزم و جواں سال قیادت دے سکتے ہیں، ان کے جذبات کو زبان دے سکتے تھے۔ لیکن وہ اس حوصلہ سے کام نہ لے سکے جس کی ایسے موقعوں پر ضرورت ہوتی ہے۔ سوال صرف یہ نہیں ہے کہ راہل گاندھی نے ایسا کیوں نہیں کیا، مشکل تو یہ ہے کہ عوامی جذبات کی جس لہر پر راہل سوار ہو سکتے تھے، اس پر آر ایس ایس کے جیالے سوار ہو جائیں، یہ خطرہ مزید بڑھ گیا ہے۔ انا ہزارے کا موازنہ ایک طرف گاندھی اور جے پی سے کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف راہل سے۔ کہا جا رہا ہے کہ جو کام برسوں کی بھاگ دوڑ میں راہل نہ کر سکے، وہ انا نے یوں کر دکھایا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ انا ہزارے نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے ہیں، وہ ان کی حمایت میں ہزاروں کی تعداد میں سڑکوں پر اتر رہے ہیں۔ اپنے سینے اور اپنے ماتھے پر 'میں انا ہوں' کی پٹی لگا کر گھوم رہے ہیں۔ ان پر جانیں قربان کر رہے ہیں، خود سوزی جیسا انتہائی قدم اٹھا رہے ہیں، انا بھی اس سے بے حد خوش ہیں۔ اس کے محرکات و عوامل سے قطع نظر اس کے پیغام کو سننے، سمجھنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر کانگریس کے منصوبہ سازوں کو چاہیے کہ وہ اس پر پوری سنجیدگی سے غور کریں۔ انا کا موازنہ گاندھی اور جے پی کی بجائے ونوبا بھاوے سے کیا جانا چاہیے جن کی بھودان تحریک نے کانگریس کے سنڈیکیٹ کے مقابلے پر انڈیکیٹ کی زمین تیار کی تھی۔ ۱۹۶۷ء کے انتخابات میں کانگریس کی حالت انتہائی پتلی تھی۔ پارٹی بے جان ہو چکی تھی، لوگوں کے دلوں میں اس کے سرمایہ داروں کی پارٹی ہونے کا خیال راسخ ہو چکا تھا۔ پہلی بار وہ کئی ریاستوں میں اقتدار سے بے دخل ہو گئی تھی۔ اندرا گاندھی کے مقابلے سنڈیکیٹ کی شکست اور پارٹی کے بٹوارے کا اثر یہ ہوا کہ اس میں نئی جان آ گئی، غریبوں اور اقلیتوں میں کانگریس کے تئیں اعتماد پیدا ہوا۔ اور یہ دونوں طبقات کانگریس کے ساتھ مضبوطی سے جڑے جس کا ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں فائدہ ہوا۔ کانگریس کی تاریخ اور اندرا گاندھی کی سیاسی زندگی پر نظر رکھنے والے کسی طفل مکتب کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ۷۱ء کی کامیابی میں ونوبا بھاوے اور ان کی بھودان تحریک کا کیا کردار تھا اور غریبوں میں زمین کی تقسیم، بینکوں کو قومیانے کے فیصلے اور غریبی ہٹاؤ کے نعرہ نے ملک کی سیاسی فضا کس طرح بدل دی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ آر ایس ایس نے اپنے اکھڑے ہوئے قدموں کو جمانے کے لیے ونوبا بھاوے اور بھودان تحریک کو استعمال کرنے کی کوشش کی اور اسے اس میں کسی حد تک کامیابی بھی ملی لیکن جو غلطی انا ہزارے کے ساتھ منموہن حکومت کر رہی ہے اگر وہی اندرا گاندھی نے ونوبا کے ساتھ کیا ہوتا تو ان کو آر ایس ایس کی طاقت بننے سے کون روک سکتا تھا۔ گئوکشی کے خلاف ونوبا بھاوے کا آمرن انشن اب بھی بہت سے لوگوں کو یاد ہوگا، آر ایس ایس نے ٹکرائو کی وہی فضا بنانے میں کون سی کسر اٹھا رکھی تھی، جو آج کرپشن اور انا ہزارے کی بھوک ہڑتال پر بنانے میں لگی ہوئی ہے لیکن وہ اندرا گاندھی تھیں جنہوں نے ونوبا کو آر ایس ایس کی طاقت بننے نہیں دیا تھا اور یہ منموہن سنگھ اور ان کا سنڈیکیٹ ہے جو انا ہزارے کو آر ایس ایس کی طاقت بنانے پر تلا ہوا ہے۔

فکرِ فردا

فلسطین کے آنسو اور فلسطینیوں کی مسکراہٹ


احمد جاوید

2025 / 06 / 18



مضمون کی ویب اشاعت سے

محمود عباس اور ان کی الفتح کے لیے اگر یہ ایک تاریخی جیت ہے تو حماس کی نگاہ میں فلسطین کی توہین اور مغربی سامراج کا ایک اور دھوکہ۔

اسرائیل اور امریکہ اپنے اسی منصوبہ پر ایک ایک قدم کر کے آگے بڑھ رہا ہے جو پلان اس نے مرحوم یاسر عرفات کے سامنے رکھا تھا اور جس جال میں آنے سے شیر عرب نے انکار کر دیا تھا۔ اوسلو معاہدہ کے بعد امریکی صدر بل کلنٹن اور اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن نے صدر عرفات سے غرب اردن اور غازہ پٹی (نام نہاد خود مختار فلسطین) کو دنیا کی جنت بنا دینے کی پیشکش کی تھی۔ اس کے عوض ان کو صرف یروشلم پر اپنے دعوے سے دست بردار ہونا اور ۵۰ لاکھ فلسطینی پناہ گزینوں کی واپسی کی ضد ترک کرنا تھا

احمد جاوید گزشتہ سے پیوستہ فلسطین کے لوگ ابھی لہولہان تھے، ابھی اسرائیلی بمباری کی چنگاریاں ان کی آنکھوں میں چمک رہی تھیں، ابھی ان کے زخموں سے خون ابل رہا تھا اور وہ ابھی تڑپ ہی رہے تھے کہ نیویارک سے فلسطین کو اقوام متحدہ میں مبصر ریاست کا درجہ دینے کی خبر آئی اور ہماری آنکھوں کے سامنے یہ منظر تھا کہ جیسے کوئی لہولہان شخص بے شان و گمان مسکرا دے، جیسے کوئی معصوم بچہ روتے روتے ہنس دے یا جیسے کسی بیوہ کی مانگ میں کوئی اچانک سیندور بھر دے۔ اور میرے ذہن و فکر میں مغربی سامراج کے مکر و فریب کی پوری ایک صدی گردش کر رہی تھی۔ بالفور اعلامیہ کے اجرا کو اب سو سال ہونے کو ہیں۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ کیسا شرمناک دوہرا کھیل ہے جو فلسطین کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے اور یہ کہ جو کھیل پچھلی صدی کی ابتدا میں شروع ہوا تھا وہ اکیسویں صدی کی دہلیز پر بھی بدستور جاری ہے۔ نہ کسی کو فلسطین کے زخموں پر رحم آیا، نہ اس کے بہتے لہو نے متاثر کیا، نہ اس کی معصومیت پر ترس آئی، صیہونیت کل بھی پھل پھول رہی تھی آج بھی پھل پھول رہی ہے۔ یہ معمہ شاید ایک عام آدمی کی سمجھ میں نہ آئے کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فلسطین کو مبصر ریاست کا درجہ دینے کی اس تجویز کی سخت مخالفت بھی کی، اس کی منظوری پر اپنی شدید ناراضگی کا اظہار بھی کیا لیکن ان میں سے کسی نے اس کے خلاف اپنے حق تنسیخ (ویٹو) کا استعمال کیوں نہیں کیا۔ اسرائیل کے لیے بات بات پر ویٹو کا استعمال کرنے اور اس کی انسانیت سوز فوجی کارروائیوں کی مذمت تک کی قرار دادیں منظور نہ ہونے دینے والے امریکہ نے بھی اس بار ایسا نہیں کیا لیکن نیو ورلڈ آرڈر اور اسرائیل و فلسطین کی تازہ سیاسی صورتحال پر نگاہ رکھنے والے کسی طفل مکتب کو بھی بتانے کی

فلسطین کے آنسو اور فلسطینیوں کی مسکراہٹ تسلسل

ضرورت نہیں ہے کہ اس کا راز کیا۔ یہ ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔ برطانیہ نے فلسطین پر ایک اور قرطاس ابیض جاری کیا تھا۔ وہ ایک طرف عربوں کو یہ یقین دہانی کرا رہا تھا کہ یہودیوں کے قومی گھر سے اس کی مراد کوئی علاحدہ مملکت نہیں بلکہ یہودیوں کی ثقافتی خود مختاری ہے لیکن دوسری جانب وہ یہودیوں کی اس تحریک نقل مکانی کی حمایت بھی کر رہا تھا جو وہ فلسطین کو اپنا ملک بنانے کے لیے چلا رہے تھے۔ اس نے اس اقرطاس ابیض میں اس تحریک کی مخالفت کی ڈھکے چھپے لفظوں میں مذمت کی تھی تاکہ عربوں کو دی جانے والی طفل تسلیوں پر صیہونی لیڈران چیں بہ جبیں نہ ہوں۔ اس دستاویز میں فلسطین میں یہودیوں کے زمین خریدنے پر پابندی عاید کی گئی تھی اور اس میں فلسطین کی آزادی کا ایک دس سالہ منصوبہ بھی بیان کیا گیا تھا۔ لیکن اب بہتر سال بیت گئے فلسطین کو تو آج تک آزادی نہیں ملی، ہاں! اسرائیل کی علاحدہ مملکت چند ہی برسوں میں وجود میں آگئی تھی۔ امریکہ اور برطانیہ نے ۲۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو سوئزرلینڈ میں فلسطین سے متعلق ایک مشترکہ رپورٹ جاری کی تھی۔ اس اینگلو امریکن انکوائری رپورٹ کے انڈیکس نمبر ۴ میں فلسطین کا تاریخی پس منظر تحریر کیا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے فلسطین کی کل آبادی ۶ لاکھ ۸۹ ہزار تھی اور اس میں یہودیوں کی تعداد فقط ۸۵ ہزار۔ لیکن اسی امریکہ، برطانیہ اور اس کے حلیفوں نے پہلی جنگ عظیم سے دوسری جنگ عظیم تک کی درمیانی مدت میں دنیا بھر سے ہزاروں یہودیوں کو فلسطین پہنچایا بھی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ڈیڑھ دو سال کے اندر اندر دنیا کے نقشہ پر اس نئے ملک کو جنم بھی دے دیا جو مغربی سامراج کی کوکھ میں پہلی جنگ عظیم کے زمانے سے پل رہا تھا۔ ہم اگر آج اقوام متحدہ میں فلسطین کو مبصر ریاست کا درجہ دئے جانے کو فلسطین کی جیت سمجھیں تو یہ ایک تاریخی بھول اور ایک انتہائی بھیانک سادہ لوحی ہو گی۔ اسرائیل، امریکہ اور ان کے حلیف ممالک تو کب سے چاہتے ہیں کہ فلسطین ایک علاحدہ نیم خود مختار ریاست کی حیثیت سے خود کو تسلیم کرلے کیونکہ اسی صورت میں اسرائیل کو اپنے وجود کی ضمانت حاصل ہو سکتی ہے ورنہ پچھلی ایک صدی سے دنیا کے کونے کونے سے یہودیوں کو یہاں لا لا کر بسائے جانے کے باوجود بھی وہ اقلیت ہیں میں۔ صدر بارک اوبامہ نے پچھلے سال بہار عرب کے پس منظر میں امریکی جیوش کمیونٹی سے خطاب کرتے ہوئے اسرائیل کو مشورہ دیا تھا کہ اگر اسے اس کی سرحدوں کے تحفظ کی ضمانت مل جاتی ہے تو بہتر ہو گا کہ وہ ۱۹۶۷ء کی سرحدوں پر چلا جائے۔ یہ کوئی اتفاقی مشورہ ، محض جوش رواداری یا عربوں کا خوف نہیں تھا۔ یہ مستقل امریکی پالیسی ہے جس میں وقت کے لحاظ سے پیش قدمی یا پسپائی ہوتی رہتی ہے لیکن بنیادی موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اسرائیل اور امریکہ اپنے اسی منصوبہ پر ایک ایک قدم کر کے آگے بڑھ رہا ہے جو پلان اس نے مرحوم یاسر عرفات کے سامنے پیش کیا تھا اور جس جال میں آنے سے شیر عرب نے صاف انکار کر دیا تھا۔ مبصر ریاست کا یہ درجہ بھی ایک جال ہے ۔ اوسلو معاہدہ کے بعد امریکی صدر بل کلنٹن اور اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن نے صدر عرفات سے غرب اردن اور غازہ پٹی (نام نہاد خود مختار ریاست) کو دنیا کی جنت بنا دینے کی پیشکش کی تھی۔ اس کے عوض ان کو صرف یروشلم پر اپنے دعوے سے دست بردار ہونا اور ۵۰ لاکھ فلسطینی پناہ گزینوں کی واپسی کی ضد ترک کرنا تھا لیکن یاسر عرفات نے ان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ پناہ گزینوں کی واپسی اور یروشلم (بیت المقدس) کے بغیر وہ فلسطین کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور ان کا یہی قصور تھا کہ جس شخص کو امریکہ نے کل وہائٹ ہاؤس کے سبزہ زار پر استقبالیہ دیا تھا، اگلے دن اسی کو نشان عبرت بنا دینے کی دھمکی دے دی تھی اور یک طرفہ طور پر یروشلم کو فلسطین کی راجدھانی تسلیم کر لینے اور تل ابیب سے امریکی سفارت خانہ منتقل کر کے یروشلم لے آنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس وقت تک یاسر عرفات کو راملہ میں محصور رکھا گیا جب تک کہ وہ شدید بیمار نہ ہو گئے اور ان کو بے ہوشی کی حالت میں علاج کے لیے باہر لے جایا گیا جہاں سے ان کا جنازہ آیا اور ان کی جگہ الفتح میں ان کے نائب محمود عباس نے لی۔ اس کے بعد کے سلسلہ واقعات پر نگاہ ڈالیں

فلسطین کے آنسو اور فلسطینیوں کی مسکراہٹ تسلسل

تو آپ پائیں گے انتخابات میں حماس کو عوام کی زبردست حمایت حاصل ہوئی لیکن اسرائیل، امریکہ اور ان کے حلیفوں نے اس کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا کیونکہ یہ ان کی نگاہ میں دہشت گردوں کی تنظیم ہے، محمود عباس امریکہ کی گود میں کھیلنے لگے اور اس کے نتیجے میں فلسطین انتظامی طور پر مغربی کنارے اور غازہ پٹی میں تقسیم ہو گیا اور اب بھی تقسیم ہے۔ محمود عباس کی تجویز پر اقوام متحدہ میں فلسطین کو مبصر ریاست کا درجہ دیا جانا اگر الفتح کے لیڈران و کارکنان کی تاریخی جیت ہے تو حماس کی نگاہ میں جو فلسطین اور القدس کی مکمل اور غیر مشروط آزادی سے کم پر کسی قیمت پر راضی نہیں ہے، یہ فلسطین کی توہین اور اس کے ساتھ مغربی سامراج کا ایک اور دھوکہ ہے۔ تصویر کا ایک اور رخ یہ ہے کہ اس وقت اسرائیل میں بھی انتخابات ہونے ہیں اور فلسطین میں بھی محمود عباس کو انتخابات کا سامنا کرنا ہے۔ بین الاقوامی مبصرین کی رائے ہے کہ غازہ پر حملے کی وقتی وجہ چاہے جو بھی رہی ہو، خواہ حماس کے فوجی سربراہ کے قتل کے جواب میں راکٹ داغے جانے کے رد عمل میں ہی اس نے ایسا کیوں نہ کیا ہو لیکن غازہ پٹی کو لہولہان کیا جانا بھی نتن یاہو کی ناپاک سیاست تھی، امریکہ کی مداخلت پر جنگ بندی بھی اسی کھیل کا حصہ ہے اور فلسطین کو یو این میں مبصر ریاست کا درجہ دینے کی تجویز بھی محمود عباس کی امیج سازی کی مہم کا حصہ ہے۔ اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں کہ فلسطین کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے عزم مصمم کا اظہار اور فلسطینی انتظامیہ کا فنڈ روک دینے کا اعلان کر کے نتن یاہو نے متوسط طبقات کے ووٹروں کو اپنے حق میں کر لیا ہے ورنہ لگاتار جنگ اور تشدد کے نتیجے میں اسرائیل میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو چکا ہے جو عدم استحکام، عدم تحفظ اور خوف و دہشت سے نکلنا چاہتا ہے۔ ۲۰۰۵ء میں غازہ پٹی سے اسرائیل کا انخلا یہی اندرونی دباؤ تھا۔ ۵۰ لاکھ فلسطینیوں کو بے گھر اور مزید ۲ کروڑ کو دوسرے درجے کا شہری بنا کر اگر اسرائیل اپنے وجود کی گارنٹی چاہتا ہے اور امریکہ و برطانیہ اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں تو ان میں سے ہر ایک خوب واقف ہے کہ یہ کاٹھ کی ہانڈی کب تک چولہے پر چڑھی رہے گی۔ اسرائیلی قیادت اقتدار پر قابض رہنے کے لیے بھی دفاع کی آڑ میں جنگی جنون پیدا کرتی ہے اور اسرائیل کے وجود کی گارنٹی برقرار رکھنے کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ۱۹۹۶ء میں لبنان پر اور ۹-۲۰۰۸ء میں غازہ پر حملے کا فیصلہ اس نے عام انتخابات سے ٹھیک پہلے کیا تھا۔

اسی تحریر سے

اسرائیل اور امریکہ اپنے اسی منصوبہ پر ایک ایک قدم کر کے آگے بڑھ رہا ہے جو پلان اس نے مرحوم یاسر عرفات کے سامنے رکھا تھا اور جس جال میں آنے سے شیر عرب نے انکار کر دیا تھا۔

فکرِ فردا

سوال صرف مودی کی خود سری کا نہیں، مسئلہ ملک کے آئین و قانون کی بے بسی کا ہے



احمد جاوید

2025 / 06 / 18

احمد جاوید یہ اپریل ۲۰۰۲ء کی بات ہے جب ملک کے وزیر اعظم نے تاریخ کے ہولناک ترین فسادات کی آگ میں سلگتے گجرات کا دورہ کیا تھا۔اس وقت تک ریاست کے طول و عرض میں بھڑکتے وحشت و بربریت کے شعلے بہ ظاہر خاموش ہو چکے تھے۔لیکن ان کی تباہ کاریوں کے مناظر اب بھی اتنے بھیانک تھے کہ ہندوستان کا وزیر اعظم اندر سے کانپ گیا تھا۔اس نے کہا تھا:'ہندوستان کے ماتھے پر اس کلنک کے ساتھ ہم دنیا کو کیا منھ دکھائیں گے'۔گجرات کے مقتلوں سے گزرتے ہوئے وزیر اعظم ہند نے جو دوسری بات کہی تھی،وہ وزیر اعلی نریندر مودی کو'راج دھرم' نبھانے کی نصیحت تھی۔وہ دن ہے اور آج کا دن،دس سال کا عرصہ بیت گیا۔اس مدت میں پلوں کے نیچے سے نہ جانے کتنا پانی بہہ چکا لیکن اگر کچھ نہیں بدلا تو وہ ہے نریندر مودی اور مظلومین گجرات کی حالت زار۔دنیا کا ہر کلنک وقت کے ساتھ ہلکا پڑ جاتا ہے لیکن ہندوستان کے ماتھے کا یہ کلنک ہر دن گہرا ہی ہوتا جارہا ہے۔مودی نے 'راج دھرم' کیسا نبھایا اس کا تازہ نمونہ اب ان اعلی افسروں پر حکومت کے عتاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جو بہ وجوہ قانون کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور سپریم کورٹ کی مقرر کردہ خصوصی تفتیشی ٹیم (ایس آئی ٹی) یا ناناوتی کمیشن کے سامنے منھ کھول رہے ہیں۔اس وقت ہندوستان کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپیئی تھے اور آج اس کرسی پر منموہن سنگھ ہیں۔واجپیئی تو مودی کو راج دھرم نبھانے کی ذو معنی نصیحت بھی کر سکتے تھے، یہ تو وہ بھی نہیں کر سکتے۔ملک کے آئین و قانون کی بے بسی واجپیئی کے الفاظ میں بھی رو رہی تھی، منموہن کی خاموشی میں بھی چیخ رہی ہے۔سری کمار، سنجیو بھٹ، راہل شرما، رجنیش رائے، اس فہرست میں ہر دن کوئی نیا نام جڑتا جارہا ہے۔یہ کوئی معمولی یا ادنی درجے کے افسران نہیں ہیں، یہ گجرات پولس کے آئی جی، ڈی آئی جی اور کمشنر ہیں۔ملک کی داخلی سلامتی کے نظام کی ریڑھ کی ہڈی آئی پی ایس افسران۔سنجیو بھٹ نے سپریم کورٹ کو یہ سچ بتانے کی جرأت کی تھی کہ 'گودھرا کانڈ کے بعد ۲۸ فروری ۲۰۰۲ء کی شام وزیر اعلی مودی نے اپنی سرکاری رہائشگاہ پر اعلی افسروں کی میٹنگ بلا کر ریاست کی پولس کو ہدایت دی تھی کہ مسلمانوں کو سبق سکھانا ہے، ہندوئوں کو ان پر اپنا غصہ نکالنے کی کھلی چھوٹ دی جائے' اور راہل شرما کا گناہ یہ ہے کہ انہوں نے ایس آئی ٹی کو گودھرا کانڈ کے بعد ٹیلی فون پر ریاست کے پولس افسروں اور وزیروں کی گفتگو کے ریکارڈز مہیا کرادئے تھے۔اب یہ معطل ہیں، ان کے خلاف ضابطہ شکنی کی کارروائی کی جارہی ہے، انہیں طرح طرح سے ہراساں کیا جارہا ہے، اور یہاں تک کہ بہ قول ان کے ان کی جانیں خطرے میں ہیں۔یہ تو وزیر اعظم منموہن سنگھ ہیبتا سکتے ہیں کہ ان کے خلاف حکومت گجرات کی انتقامی کارروائی کیا صرف مودی کی خود سری ہے یا ملک کے آئین و قانون کی بے بسی؟ وزیر داخلہ پی چدمبرم کے یہ الفاظ کہ 'اگر وہ افسران چاہیں تو مرکز اس معاملے میں مداخلت کر سکتا ہے' کیا اس بے بسی کا صرف ایک اور ا شتہار نہیں ہے؟ کوئی ان سے پوچھے کہ کیا مرکز کو اس کی ان ذمہ داریوں کا بھی کچھ احساس ہے جو اس پر آئین کی دفعہ ۳۵۵ اور ۳۵۶ عاید کرتی ہیں؟ کیا ان اختیارات کا استعمال صرف سیاسی مقاصد کے لیے ہی کیا جاتا رہے گا یا صحیح معنوں میں ملک کے آئین و قانون کی حفاظت کے لیے بھی کبھی کیا جائے گا؟ بہار میں نکسلیوں کے ہاتھوں ایک گائوں کے درجن بھر لوگ مارے جائیں تو آپ دفعہ ۳۵۶ لے آئیں، جھارکھنڈ میں ممبران اسمبلی کی خرید و فروخت کے اندیشہ محض پر صدر راج لگادیں، کشمیر کو علاحدگی پسندوں کی بیخ کنی کے لیے فوج کے حوالے کردیں، شمال مشرق کے انتہا پسندوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے مرکزی دستوں کو خصوصی اختیارات دے دئے جائیں لیکن گجرات میں ہزاروں انسانوں کے بہیمانہ قتل اور آئین و قانون کی کھلی پامالی پر آپ کے

سوال صرف مودی کی خود سری کا نہیں، مسئلہ ملک کے آئین و قانون کی بے بسی کا ہے تسلسل

ہاتھ شل ہو جائیں۔ واجپیئی کے ذہن و ضمیر پر بے شک ہندوتو کا پردہ پڑا تھا وہ ہندو راشٹر کے علمبردار تھے، ان سے کسی کو بھی یہ امید نہیں تھی کہ وہ مودی کی حکومت کو برخاست کر کے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے ماتھے کا کلنک دھو دیں گے لیکن آپ تو جمہوریت اور سیکولرزم کی علمبرداری کے بلند بانگ دعویدار ہیں۔ آپ ہی کہہ رہے ہیں کہ گجرات میں قانون کی دھجیاں اڑائی جائی رہی ہیں، آئین کی روح پامال کی جارہی ہے، سچ بولنے والے افسروں کو کچلا جارہا ہے اور آپ ہی سے جب پوچھا جاتا ہے کہ آپ کی سرکار کیا کر رہی ہے تو بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ مرکزی سرکار مداخلت کر سکتی ہے مگر اسکے لیے ان افسران کو مرکز کی مدد کرنی ہوگی۔ وہ وعدالتوں میں گواہی دے رہے ہیں، حلف نامے پیش کر رہے ہیں، سرکاری دستاویزات، ٹیلی فون کالز اور ای میل پیغامات کے ریکارڈز کی شکل میں پختہ ثبوت مہیا کرا رہے ہیں۔ بھلا آپ کو اور کون سی مدد چاہیے، آئین و قانون کے اس باغی کے خلاف ابھی اور کتنے ثبوت درکار ہیں، آخر آپ کس کو بے وقوف بنانا چاہتے ہیں؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ گجرات میں آئین کی حکمرانی ختم ہو چکی ہے، عدالتیں مظلوموں کو انصاف دینے سے قاصر ہیں، بے گناہوں کو تو پھانسی چڑھایا جارہا ہے لیکن مجرموں کو رہائی دی جارہی ہے، کیونکہ حکومت خود مجرموں کی پشت پناہی میں لگی ہوئی ہے؟ کیا سنجیو بھٹ ، سری کمار، راہل شرما، رجنیش رائے جیسے اعلی افسران کے حلفیہ بیانات وانکشافات یہ ثابت نہیں کرتے کہ گجرات میں انصاف پر ہندوتو کا پہرہ ہے، سپریم کورٹ کی مقرر کردہ ایس آئی ٹی کے اندر تک آر ایس ایس کے ایجنٹ بیٹھے ہیں۔ گجرات کا محکمہء قانون اور وزیر اعلی کا دفتر ان مجرموں کو بچانے میں لگا ہے جن کے خلاف عدالت عظمی نے از سر نو تحقیقات کا حکم دیا تھا۔ سابق وزیر اعظم واجپیئی نے جب مودی کو راج دھرم نبھانے کی نصیحت کی تھی تو شاید ان کے بھی وہم و گمان میں نہ رہا ہوگا کہ مودی حکومت ایسا راج دھرم نبھائے گی۔ ابھی واجپیئی کی سواری گجرات سے نکلی بھی نہ ہوگی کہ اس شخص کو پھانسی چڑھانے کی تیاری شروع کر دی گئی تھی جس نے گودھرا میں وزیر اعظم سے گجرات کا درد بانٹنے کی گزارش کرنے کی جرأت کی تھی۔ مولانا حسین عمر جی گودھرا کی ایک سب سے محترم شخصیت کا نام تھا۔ وہ گجرات میں ۱۹۶۵ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۸۰ء، اور ۱۹۸۹ء کے فسادات کے دوران ضلع انتظامیہ کی امن کمیٹیوں کے رکن رہے تھے۔ ریاست میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام، امن و شانتی کی بحالی اور متاثرین کی راحت رسانی و باز آبادکاری میں بڑھ چڑھکر حصہ لیتے آئے تھے۔ گودھرا کانڈ کے بعد بھی وہ ریلیف کیمپ چلا رہے تھے جن میں ہزاروں خانماں برباد متاثرین فسادات مہینوں رکھا۔ اس دوران کانگریس کی صدر سونیا گاندھی، سابق وزیر اعظم دیو گوڑا اور اس وقت کے وزیر دفاع جارج فرنانڈیز جیسے رہنمائوں سے ملنے والے وفود کی قیادت کی۔ ۴ اپریل کو جب وزیر اعلی نریندر مودی کے ہمراہ وزیر اعظم واجپیئی گودھرا گئے تو عمر جی نے ایک وفد کے ساتھ ان سے بھی ملاقات کی اور میمورنڈم پیش کیا لیکن انہوں نے نہ تو وزیر اعلی مودی سے ہاتھ ملایا اور نہ ان کو میمورنڈم کی کاپی دی۔ دنیا نے دیکھا کہ پھر کس طرح سابرمتی ایکسپریس کو آگ لگانے کی منصوبہ بند سازش کی ایک نئی کہانی سامنے آئی اور مولوی عمر جی کو اس کا ماسٹر مائنڈ قرار دے کر سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔ چن چن کر گودھرا کے ذی حیثیت مسلمانوں کو پوٹا کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ وہ تو کہیے کہ مودی کی پولس عدالت میں ان کا جرم ثابت نہ کر سکی ورنہ ان کو پھانسی چڑھا دینے میں کون سی کسر اٹھا رکھی گئی تھی۔ دوسری طرف گجرات کے طول و عرض میں قتل عام کے وہ تمام مقدمات داخل دفتر کر دئے گیے جو دن کے اجالے میں انجام دیئے گئے تھے اور جن کو خود واجپیئی نے ہندوستان کے ماتھے کا کلنک کہا تھا۔ شہری حقوق کی علمبردار تیستا شیتلواڑ اور ان کے ساتھی سماجی کارکنوں کی طویل قانونی جد وجہد کے بعد سپریم کورٹ نے قتل عام کے ۹ بڑے مقدمات کی از سر نو تحقیقات کا حکم دیا اور اس کے لیے خصوصی تفتیشی ٹیم تشکیل دی۔ مظلوموں کی آنکھوں میں امید کی کرنیں جاگیں لیکن پتہ چلا کہ اس میں بھی مودی کے ایجنٹ موجود ہیں، ایس آئی ٹی کی رپورٹیں بھی وزیر اعلی کے دفتر اور آر ایس ایس کو پہنچائی جارہی ہیں تاکہ وہ ان کی روشنی میں ملزمین کو بچانے کی تیاری کریں۔ سنجیو بھٹ

سوال صرف مودی کی خود سری کا نہیں، مسئلہ ملک کے آئین و قانون کی بے بسی کا ہے تسلسل

نے اپنے حلف نامہ میں صرف زبانی دعوے نہیں کئے ہیں انہوں نے ہیک کردہ ای میل پیغامات کی ایک لمبی فہرست منسلک کی ہے جو بتاتی ہے کہ ایس آئی ٹی کی رپورٹیں ایڈیشنل ایڈوکیٹ جنرل تشار مہتا کو بھیجی گئیں جنہوں نے انڈر سیکریٹری ہوم وجے بڈیکھا کو بھیجا اور بڈیکھا نے یہ رپورٹیں آر ایس ایس کے گرو گھنٹال سوامی ناتھن گرو مورتھی کو مہیا کرائیں۔ گرو مورتی سے نریندر مودی بھی مشورے لے رہے تھے اور گلبرگ سوسائٹی قتل عام کے ملزمین کے وکیل مہیش جیٹھ ملانی بھی ہدایات حاصل کر رہے تھے۔ ۲۷ و ۲۸ مارچ کو ایس آئی ٹی نے مودی سے تفتیش کی تھی۔ ۳۰ مارچ کو گرو مورتی نے ایک میمورنڈم وزیر اعلی کے دفتر کو بھیجا جو تشار مہتا نے ڈرافٹ کیا تھا۔ یہ میمورنڈم لال کرشن اڈوانی، ارون جیٹلی ، سشما سوراج، اور نتن گڈکری نے وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ کو پیش کیا جس میں تیستا شیتلواڑ اور ان کی تنظیم کے خلاف تحقیقات کرانے کی مانگ کی گئی تھی۔ جن پر مظلوموں کو انصاف دلانے کی ذمہ داری تھی وہی تشار مہتا احسان جعفری کے قاتلوں کے جوابی حلف نامے ڈرافٹ کر کے گرو مورتی اور مہیش جیٹھ ملانی کو ای میل کر رہے تھے۔ سنجیو بھٹ انٹلی جنس کے ایک اعلی افسر ہیں۔ ای میل ہیک کرنا ان کی منصبی ذمہ داری تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ برسوں خاموش رہے لیکن اب جبکہ عدالت عظمی میں ثبوتوں کے ساتھ وہ اس حقیقت کو بے نقاب کر چکے ہیں کہ گجرات میں انصاف پر آر ایس ایس کا پہرہ ہے، مودی کے اقتدار میں رہتے ہوئے مظلوموں کو انصاف ملنا ممکن نہیں تو ان کو اور ان تمام افسران کو علی الاعلان ہراساں کیا جارہا ہے جو مودی کے خلاف زبان کھول رہے ہیں۔ ان کو معطل کیا جارہا ہے ، ان کے خلاف مراعات شکنی کی کارروائی کی جارہی ہے، اور ان کو سنگین مقدمات میں پھنسایا جارہا ہے۔ پہلے سری کمار کو ہراساں کیا گیا، پھر سنجیو بھٹ کا معاملہ سامنے آیا، اس کے بعد راہل شرما کو نوٹس دے دیا گیا کہ انہوں نے حکومت کی اجازت کے بغیر ایس آئی ٹی کو ٹیلی فون کے ریکارڈز کیوں دئے؟ کہا نہیں جاسکتا کہ یہ سلسلہ کہاں تک دراز ہوگا۔ جس حکومت اور جس ریاست میں قانون کے پاسبانوں کی یہ حالت ہے، پولس اور انٹلیجنس کے اعلی افسران عدالت کی پناہیں ڈھونڈ رہے ہیں اور اقتدار پر قابض عناصر مجرموں کو بچانے میں لگے ہوئے ہیں، اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں عام لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔

اسی تحریر سے

احمد جاوید یہ اپریل ۲۰۰۲ء کی بات ہے جب ملک کے وزیر اعظم نے تاریخ کے ہولناک ترین فسادات کی آگ میں سلگتے گجرات کا دورہ کیا تھا۔



علم بانٹیں، امید بڑھائیں

کتاب کسی نئے قاری تک پہنچائیں۔

پڑھنے، سیکھنے اور مکالمے کے لیے جگہ بنائیں۔

AHMAD JAWED FOUNDATION

فکرِ فردا

جنگل کا زمانہ، ہم اور ہمارے حکمراں



احمد جاوید

2025 / 06 / 18

فکر فردا قتل و غارت کا بازار گرم ہے، بم دھماکے ہو رہے ہیں، دہشت گردی برپا ہے اور حکمراں بٹیر لڑا رہے ہیں، پورے پورے گاؤں اور شہر جلا دئے جائیں لیکن مجرم نہیں پکڑے جائیں گے، پکڑے جائیں تو گواہی اور ثبوت کے فقدان میں چھوٹ جائیں گے۔ اسلیے کہ آج اس ملک میں ہر جگہ چوروں کی رکھوالی ہے، سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد۔ مگر اصل سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کو کون بدلے، اس قوم کی قسمت بدلنے کی ذمہ داری کس کی ہے؟

احمد جاوید آپ نے جنگل میں کی کہاوت سنی ہے، مختلف مواقع پر استعمال بھی کیا ہوگا لیکن میں نے دیکھی ہے، شاید وطن عزیز میں آج ایک ہی ایسا مقام ہے جس کو دیکھ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے جنگل میں منگل دیکھا ہے۔ جی ہاں ! انا ہزارے کا گاؤں رالیگان سدھی جہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں، ترقی اور خوشحالی کا تو پوچھیے ہی مت جس گاؤں محض ۲۰ برس پہلے سائیکل تک نہیں تھی، آج مرسڈیز موجود ہے، مغربی مہاراشٹر کے اس گاؤں میں پہنچ کر اور اس کے ماضی اور حال کو دیکھ سن کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں اور جب ہم اس کا موازنہ اپنے گاؤں اور شمالی ہندوستان کے دوسرے گاؤوں اور شہروں سے کرتے ہیں تو یہ خوشگوار حیرت شدید غصہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر شعور کی رو پکار اٹھتی ہے کہ آج کا یہ دور دورِ ترقی ہے یا جنگل کا زمانہ، عہد روشن خیالی ہے یا جاہلیت جدیدہ، اس میں کلام ممکن ہے لیکن اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس وقت جن حالات سے ہم دوچار ہیں اور جس ماحول میں ہماری نسلیں سانسیں لے رہی ہیں، وہ قدم قدم پر یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ اندھیرا ہی بھلا تھا کہ قدم راہ پر تھے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ چمتکار کیونکر ہوا جس کو رالیگان سدھی کہتے ہیں اور اس راہ پر ملک کے دوسرے گاؤں اور شہروں کو لے جانا کیونکر ممکن ہے، ہم لوگ بات بات میں زمانہ کو برا کہتے ہیں، نہ تو اپنے اعمال جائزہ لیتے ہیں، نہ یہ سوچنے کی زحمت اٹھاتے ہیں کہ زمانہ اپنے آپ سے نہیں ہے، رالیگان کو دیکھیے تو بے ساختہ زبان سے نکل جائے گا زمانہ ہم سے ہے زمانے سے ہم نہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ زمانہ کو برا بھلا کہنے والے دراصل تقدیر کو کوستے اور قدرت کو برا بھلا کہنے کے مرتکب ہوتے ہیں ورنہ اچھے برے تو انسان ہوتے ہیں، معاشرے اور قومیں اچھی بری ہوتی ہیں اور لوگوں کے حصہ میں ہمیشہ وہی آتا ہے جس کی وہ سعی و کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس ایمان و یقین کے باوجود حال کے واقعات آپ کو ماضی کے صحرا میں لے جائیں اور سورج کی کرنیں اگر رات کی تاریکیوں کی یاد دلائیں تو آپ اس کو کیا نام دیں گے۔ کس کو مجرم تصور کریں گے، سورج کو یا اس کی کرنوں کو یا اپنے مقدر کو، کس کو روئیں گے؟ میرا کیا ہے میں تو ویسے بھی ماضی پرست ہوں اور پتہ نہیں کب کس بات پر تاریخ کے ریگستانوں میں نخلستان کی تلاش کرنے نکل پڑوں۔ لیکن اس میں کس کا قصور ہے، میرے دل و دماغ کا یا اس عہد کے ناخداؤں کا، یہ تو وہی بتا سکتے ہیں جن کے ناخنوں کی تدابیر پر بھروسہ کر کے ہم نے اپنا مقدر ان کے سپرد کر دیا ہے۔ حیدر آباد میں بم دھماکے ہوئے اور ہماری سیکوریٹی ایجنسیوں نے اندھیرے میں تیر چلانا شروع کیا تو میں عہد وسطی کے ہندوستان میں چلا گیا اور ابھی شعور کی رو تاریخ کی وادیوں میں ہی سرگرداں تھی کہ اسے ایک جھٹکا اور لگا۔ ہمارے وزیر خزانہ نے پارلیمنٹ میں ملک کی اقتصادی ترقی کا جائزہ پیش کیا جس میں کہا گیا کہ ملک میں گوشت، مچھلی اور انڈے کی کھپت میں اضافہ ہوا ہے، لوگ کھان پان پر پہلے سے زیادہ خرچ کر رہے ہیں گویا اشیائے خوردنی کی کمر توڑ مہنگائی جو ہے وہ اس لیے بڑھی ہے کہ لوگ گوشت مچھلی، دودھ دہی، گھی، انڈے وغیرہ زیادہ کھا رہے ہیں جس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ لوگوں کا معیار زندگی نسبتاً بہتر ہوا ہے۔ میں پہلے سے بھی زیادہ دور ماضی میں چلا گیا اور دیر تک تاریخ کے اوراق ذہن میں پھڑ پھڑاتے رہے۔ حیران و

جنگل کا زمانہ، ہم اور ہمارے حکمراں متسلسل

ششدر کہ تیرہوں صدی عیسوی کے سلطان علاءالدین خلجی (متوفی ۱۳۱۶ء) کو تو یہ معلوم تھا کہ جب سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں بے تحاشہ اضافہ کیا جاتا ہے تو عام لوگوں کی زندگی مہنگائی کی مار سے اجیرن ہو جاتی ہے اور قیمتوں پر کنٹرول کے لیے سخت اقدامات کرنے پڑتے ہیں، بصورت دیگر سارے مرغ و ماہی مراعات یافتہ اشرافیہ (جاگیرداران و منصب داران) ہڑپ کر جاتی ہے اور عام آدمی فاقے کی مار جھیلتے ہیں لیکن ہمارے آج کے حکمراں اتنے بھولے ہیں کہ ان کو یہ پتہ ہی نہیں کہ گوشت مچھلی اور انڈے کون کھا رہا ہے، مرغ بریانی کون اڑا رہے ہیں اور ان کی عیاشیوں کی قیمت کون لوگ چکا رہے ہیں؟ کن لوگوں کو دال روٹی کے لالے پڑ رہے ہیں؟ آج ہی خبر آئی ہے کہ حیدر آباد کے دہشت گردانہ بم دھماکوں کی گتھی ابھی تک سلجھتی نظر نہیں آتی، دہشت گردوں نے اس بار کوئی سراغ نہیں چھوڑا ہے جس کے سہارے پولیس ان تک پہنچ سکے، حتی کہ انہوں نے بم نصب کرنے کے لیے جو سائکلیں استعمال کی تھیں وہ بھی خود ہی بنائی تھیں۔ میں پھر ترقی اور جدیدیت کے ساتویں آسمان سے پوری شدت کے ساتھ دھڑام سے عہد وسطی کی سنگلاخ زمین پر گرا۔ سونیا منموہن، پی چدمبرم یا سشیل کمار شندے کے زمانے کا ہندوستان نہیں تھا، نہ اس دور میں ڈجیٹل کمیونکیشن تھی، نہ موبائیل فون، انٹرنیٹ، سٹلائٹ فون، ویڈیو کانفرنسنگ اور فیکس۔ برق رفتار جیٹ بھی نہیں تھے۔ ملک کے مختلف علاقے ابھی چھوٹے چھوٹے انتظامی خطوں میں بھی نہیں تقسیم تھے اور ہر انتظامی خطہ دوسرے خطہ سے منسلک بھی نہیں تھا۔ بس، ٹرین اور کار بھی نہیں تھی، فریادیوں کو حکومت تک پہنچنے میں کئی سال لگ جاتے تھے۔ اور سرکاری احکامات پر عمل درآمد میں اکثر اس سے بھی زیادہ وقت لگتے تھے۔ لیکن بڑھیا اس کے باوجود شیر شاہ سوری کے دربار تک پہنچ گئی۔ اس کا اکلوتا جوان بیٹا لکڑیاں کاٹنے کے لیے جنگل میں گیا اور اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔ وہ مقامی ناظم کے پاس گئی لیکن اس نے گواہوں کی غیر موجودگی کا رونا رو کر معذرت کر لی، صوبیدار کے پاس گئی اس نے بھی مقدمہ داخل دفتر کر دیا۔ ظلم اور ناانصافی انسان کو یکسو بھی کر دیتا ہے اور جرأت مند بھی بنا دیتا ہے۔ بڑھیا جہلم سے نکلی اور مہینوں کا سفر کر کے دار الحکومت پہنچ گئی۔ شیر شاہ سوری ہفتے میں ایک دن دربار عام لگاتا تھا۔ اس دن کوئی بھی فریادی اس کے سامنے پیش ہو سکتا تھا۔ بڑھیا اپنی باری پر کھڑی ہو گئی۔ بادشاہ نے ماجرا پوچھا تو اس کے سارے دکھ آنسوؤں میں بہنے لگے۔ وہ روتی رہی، چیختی رہی اور بادشاہ سنتا رہا۔ پتہ چلا کہ بڑھیا کے بیٹے کو کسی نے جنگل میں مار دیا اور پولیس و انتظامیہ پتہ نہیں لگا سکی۔ بادشاہ نے اس سے وعدہ کیا 'میں ایک ہفتے میں تمہارے مجرم تمہارے سامنے پیش کر دوں گا۔' مدعیہ کو شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرا دیا گیا۔ دو دن گزرے تو جہلم کے ناظم اور کوتوال کو اطلاع ملی چند لوگ جنگل میں درخت کاٹ رہے ہیں۔ یہ فوراً فورس لے کر جنگل پہنچ گئے۔ فورس نے جنگل کاٹنے والوں کو گرفتار کر لیا۔ چند لمحے بعد شیر شاہ کی فوج جہلم پہنچی اور اس نے ناظم اور کوتوال کو گرفتار کر لیا۔ جنگل کاٹنے والے لوگ بادشاہ کے آدمی تھے۔ برق رفتار گھوڑوں سے دونوں کو دربار تک پہنچایا گیا۔ بادشاہ نے ان سے صرف ایک سوال پوچھا 'جنگل میں لکڑی کاٹی جا رہی تھی تو تمہیں ایک پہر میں اطلاع مل گئی لیکن انسان قتل ہوا تو آج تک گواہ نہیں ملا؟' دونوں نے بادشاہ سے تین دن کی مہلت مانگی اور بادشاہ نے حکم لکھوایا کہ یہ اگر تین دن میں مجرم نہ پیش کریں تو ان کی گردنیں مار دی جائیں۔ پولیس چیف اور ناظم بھاگا، مجرم کی تلاش کی اور قاتل کو پیش کر دیا جس نے اعتراف جرم کر لیا۔ بادشاہ نے حسب وعدہ مجرم کو بڑھیا کے حوالے کر دیا اور اس کے ساتھ ہی حکم جاری کیا کہ ہماری سلطنت میں قتل کا مجرم ایک ہفتے کے اندر گرفتار ہونا چاہیے۔ اگر مقامی انتظامیہ ایسا نہیں کرتی ہے تو بادشاہ کے حکم کے مطابق ذمہ دار افسران کا سر اتار دیا جائے اور نعش اس وقت تک کے لیے شہر میں لٹکا دی جائے جب تک مجرم گرفتار نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد شیر شاہ سوری کے دور کے ہندوستان میں کوئی قتل نہیں ہوا اور اگر ہوا تو مجرم دوسرے دن عدالت کے کٹہرے میں تھا۔ یہ آج سے ۴۷۲ سال پرانی اس دور کی مثال ہے جب دنیا نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، نہ ٹرین تھی نہ برق رفتار جہاز، نہ اطلاعات کے وہ ذرائع جو پلک جھپکتے میں دنیا کے

جنگل کا زمانہ، ہم اور ہمارے حکمراں تسلسل

ایک کونے سے دوسرے کونے میں خبر پہنچادیتے ہیں، نہ فنگر پرنٹس، ڈی این اے، اور ٹرانزٹ سسٹم، دنیا میں ابھی انٹر پول اور ریڈ وارنٹ کا تصور بھی وجود ہیں نہیں آیا تھا۔ شہروں میں سی سی ٹی وی کیمرے بھی نہیں لگے تھے۔ اس کے باوجود مجرموں کی کیا مجال تھی کہ وہ اتنی آسانی سے جرم کریں اور سزا سے بچ جائیں جتنی بے خوفی سے وہ آج جو چاہتے ہیں کر رہے ہیں۔ اس دور کی صرف ایک خوبی تھی۔ اس دور میں کوئی منموہن سنگھ اور سشیل شندے یا اکھلیش یادو اور راجا بھیا جیسے لوگ حکمراں نہیں تھے۔ اس دور میں اس ملک کی حکومت شیر شاہ جیسے وژنری، انصاف پسند اور ایماندار شخص کے ہاتھوں میں تھی جس نے صرف پانچ سال کی مدت میں نہ صرف پورے ملک کی پیمائش کرادی تھی، ملک کے ایک کونے کو دوسرے کونے سے جوڑ دیا تھا اور مالیہ کا ایسا نظام وضع کیا جو آج تک اس خطے میں قائم و رائج ہے۔ اس نے خود کو بھی ملک کے عوام کے تئیں جوابدہ بنایا اور مقامی ناظموں، کوتوالوں اور دوسرے سرکاری منصب داروں کو بھی جوابدہ بنایا۔ یہ نہیں کہ قتل و غارت کا بازار گرم ہے، بم دھماکے ہو رہے ہیں، دہشت گردی برپا ہے اور حکمراں بٹیر لڑا رہے ہیں، پولیس اور انتظامیہ بے گناہوں پر مظالم ڈھا رہی ہے اور ارباب اقتدار پڑے سو رہے ہیں۔

اسی تحریر سے

احمد جاوید آپ نے جنگل میں کی کہاوت سنی ہے، مختلف مواقع پر استعمال بھی کیا ہوگا لیکن میں نے دیکھی ہے، شاید وطن عزیز میں آج ایک ہی ایسا مقام ہے جس کو دیکھ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے جنگل میں منگل دیکھا ہے۔

فکرِ فردا

اور جب مذہب افیون کی گولی بن جاتا ہے



احمد جاوید

2025 / 06 / 18

کیا پیغمبر اسلام ﷺ نے بچوں کے حقوق کی تعلیم نہیں دی یا ان کے حقوق پر بہت زیادہ زور نہیں دیا؟

فکر فردا ہم اس جلسہ گاہ سے نکلے تو درد و کرب، ندامت، مایوسی اور امید کی ملی جلی کیفیات و احساسات سے دوچار تھے۔ ہمارے لیے یہ مناظر نہ تو نئے تھے نہ ان سے ہم پہلی بار دوچار ہوئے تھے۔ سچ پوچھئے تو ایسے دردناک مناظر کے درمیان جیتے جیتے ہم لوگ بے حس ہو چکے ہیں، غریبی اور جہالت ہر دن ہمارے ضمیروں پر ہتھوڑے برساتی ہے لیکن ان دستاویزات نے ان کیفیات کو ایک دم اور ایک ساتھ تازہ کر دیا جن کو ہم لمحے بھر کو بجلی کی آتی جاتی لہروں کی طرح محسوس کرتے اور بھول جاتے ہیں۔ احمد جاوید اس دن ہم نئی دہلی کے انڈیا ہیبیٹاٹ سینٹر میں یونیسیف کی ایک تقریب میں شریک تھے۔ اقوام متحدہ کا یہ ادارہ جس کا پورا نام یو این چلڈرن فنڈ ہے، دنیا کے بچوں کی حالت کے عنوان سے ہر سال فروری میں ایک رپورٹ جاری کرتا ہے، جو بلا تفریق ملک و ملت دنیا بھر کے بچوں کو ان کی قوموں اور معاشروں میں درپیش مسائل و مشکلات پر اقوام عالم کی توجہ مبذول کراتی ہے۔ عموماً یہ رپورٹ کسی خاص موضوع پر مرکوز ہوتی ہے۔ ''دنیا کے بچوں کی حالت ۲۰۱۲ء'' کا موضوع ''ایک شہری دنیا میں بچے'' تھا۔ رسم اجراء کی یہ تقریب ایک مختصر دستاویزی فلم کی نمائش سے شروع ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے مراد آباد کی ایک گھنی مسلم آبادی کے لرزہ خیز مناظر تھے، نہایت غلیظ اور ناگفتہ حالات میں بڑے ہوتے بچے، کچی گلیوں میں کھلے نالوں کے ابلتے کناروں کے ساتھ دوڑتے بھاگتے بچوں کے درمیان لاٹھی کی مدد سے دوڑتا بھاگتا ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا اور ہوا میں جھولتی اس کی دوسری ٹانگ، تنگ و تاریک گلیوں میں چھوٹے چھوٹے کمروں کے اندر ظروف سازی کے کارخانے، دھاتوں کو پگھلائی جانے والی بھٹیوں کے پاس کالک، دھوئیں اور پسینے میں شرابور مزدور اور ان کے ساتھ جانوروں کی طرح محنت کرتے ننھے ننھے آٹھ آٹھ دس دس سال کے معصوم ہاتھ، چیتھڑوں سے تعمیر کردہ دربہ نما کمروں میں پورا پورا خاندان، لگتا تھا کلیجہ ابل کر منھ کو آجائے گا۔ پھر ایک گیارہ سال کا ہنستا کھیلتا خوبصورت لڑکا سامنے آیا، وہ اسکول یونیفارم اور کتابوں کے بستہ کے ساتھ اپنی دو بہنوں کے ہمراہ اپنے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ انس نے ۸ سال سے ۱۰ سال کی عمر تک ہر دن دس گھنٹے، ہفتے میں ۶ دن مراد آباد کی اسی بستی میں بھٹی کی آگ کے پاس ایک دھوئیں سے بھرے کارخانے میں گزارا تھا جہاں پیتل اور دوسری دھاتوں کے برتنوں کی صنعت میں استعمال کی جانے والی دھاتیں پگھلائی اور ڈھالی جاتی تھیں۔ اس سے وہ یومیہ دس پندرہ روپے کماتا تھا۔ انس کا باپ ایک رکشہ ٹھیلہ کھینچنے والا مزدور ہے جو یومیہ ستر اسی روپے کماتا ہے اور اس کمائی سے پانچ افراد پر مشتمل خاندان کی ضروریات مشکل سے ہی پوری ہوتی ہیں۔ انس اسکول سے آنے کے بعد اپنے بیمار دادا کے سرہانے بیٹھ گیا، ان کی نورانی داڑھی سے کھیل رہا ہے، جن کو مہنگی دواؤں کی ضرورت تھی اور خاندان یہ بوجھ مشکل سے ہی برداشت کر سکتا تھا اور اسی لیے انس دھاتوں کے اس خطرناک کام میں جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس کی خطرناکی کا ایک واضح نشان وہ اپنے پیر پر رکھتا ہے جو پگھلی ہوئی دھات سے جل گیا تھا۔ اب گیارہ سالہ انس کارخانے سے نکل کر اسکول میں ہے اور پڑھنے لکھنے میں بہت اچھا ہے۔ یونیسیف کے امداد یافتہ حقوق اطفال پروجیکٹ نے اس کی زندگی بدل دی ہے جو آنگیا فاؤنڈیشن کی مالی مدد سے چلایا جا رہا ہے۔ یہ پروجیکٹ مراد آباد کی ۱۰۱ بستیوں میں انس جیسے غریب بچوں کے لیے حق تعلیم کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پروجیکٹ نے منصوبہ کے مطابق مراد آباد کی بستیوں میں سروے کر کے ۱۴۰۰۰ سے زائد لڑکے لڑکیوں کی شناخت کی ہے جو اسکول مدرسہ سے باہر رہے ہیں۔ پروجیکٹ

اور جب مذہب افیون کی گولی بن جاتا ہے تسلسل

تربیت یافتہ رضاکاران چلا رہے ہیں، تقریباً ۷۰۰۰۰ غریب خاندانوں اور ۵۵۰۰۰ بچوں تک پہنچتا ہے۔ میڈیا کے نمائندوں کو اس کے علاوہ جو دستاویزات دیے گیے تھے ان میں چار دوسری کہانیاں بھی شامل تھیں، ایک میں مراد آباد کی ہی ایک ۲۱ سالہ خاتون جواب ایک بیٹی کی ماں ہے، اپنی دردناک کہانی سنا رہی ہے کہ کس طرح صرف ۱۵ سال کی عمر میں اس کی شادی کر دی گئی تھی اور اس کے نتیجے میں اسے کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری کہانی ممبئی کے مضافات کرلا کی ایک جھگی بستی کی ننھی بچی ناز کی ہے جواب یونیسیف کے اسکول اکسی لینس پروگرام کے تحت مقامی میونسپل اسکول میں زیر تعلیم ہے۔ اسکول میں تقریباً ۶۰۰ طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں، اسکول کی پرنسپل چاند سلطانہ بتاتی ہیں کہ ان بچوں کو اسکول چھوڑنے سے باز رکھنا بہت ہی مشکل کام ہے کیونکہ ان کو چھوٹے موٹے کام کر کے اپنے خاندان کی مدد بھی کرنی پڑتی ہے اور اگر ماں بیمار پڑ جائے تو اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ ریکھ بھی ان ہی کو کرنی ہے۔ اسکول سے محض بیس منٹ کے فاصلہ پر جھگی بستی ہے جہاں ناز اپنے والدین اور پانچ بھائی بہنوں کے ساتھ رہتی ہے۔ درجہ تین کی طالبہ ناز تنگ گلیوں سے ہوتی ہوئی جن کی دونوں طرف ڈبہ جیسے گھروں میں پورے پورے خاندان رہتے ہیں، بستی کے ایک دوسری طرف لے جاتی ہے۔ گلیوں کر پار کرتے جایئے، بالکل آخر میں جہاں ایک کھلا نالا ایک گندے تالاب میں تبدیل ہو جاتا ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں ناز کا گھر ہے۔ جھگیوں کے معیار پر بھی دیکھیں تو یہ دل دہلا دینے والا منظر ہے۔ پلائی کی دیواریں جن کے آر پار سب کچھ نظر آتا ہے، اندر ایک ہی ننگا بلب دو کمروں کو روشنی دیتا ہے۔ پھر بھی ان بچوں کو معمولی قیمت کی اسکولی چیزیں جو ان کو مفت ملتی ہیں، جوتے لنچ بکس، جیومیٹری سیٹ، مڈ ڈے میل اور فری تعلیم اسکول لے جاتی ہے۔ ناز کی ماں شہناز بیگم ناخواندہ ہے اور اپنی عمر تیس بتیس سال بتاتی ہے۔ اس کا آخری بچہ صرف ایک ماہ کا ہے اور اسے فلیریا ہو گیا ہے جو ان جھگیوں میں عام ہے جہاں ٹروپیکل پیراسائٹس کی افزائش ہوتی ہے۔ اس کا شوہر یومیہ مزدور ہے۔ اس پر مستزاد اسے پینے کی عادت ہے جو اسے اس خاندان کی فکر سے ہٹا دیا کرتی ہے جو اکثر دو وقت کے کھانے کے لیے ترستا ہے۔ ننھی سی ناز کے ساتھ اپنی ہتھیلیوں پر احتیاط سے اس کی بہن تبسم کو سنبھالے ہوئے، شہناز بیگم کہتی ہے ”علم رہے تو اچھا رہے، آجکل کے زمانے میں تو ضروری ہے“ ناز اس کی بات میں اپنی معصوم خواہش جوڑ دیتی ہے ”میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں“۔ تیسری کہانی کولکاتہ کے سیالدہ کی ہے جس میں ایک گھریلو ملازمہ کی بیٹی رخشندہ اپنی سرگزشت سنا رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ اس کا سپنا فضاؤں میں پرواز کرنے کا ہے۔ یہ مقامی اسکول لوریٹو ڈے کے رینبو چلڈرن (قوس قزح بچے) پروگرام کی بدلت ممکن ہو سکا ہے کہ ایک غریب خاتون جس کے لیے دو وقت کی روٹی جٹا پانا ممکن نہیں تھا اس کی بیٹی شہر کے ایک سب سے اچھے پرائیویٹ اسکول کی ساتویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ رخشندہ بتاتی ہے ’میری ماں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ میں اپنے حال پر چھوڑ دی گئی تھی۔ دو سال پہلے کسی نے ان کو رینبو اسکول کے بارے میں بتایا اور پھر میری زندگی دوبارہ کبھی ویسی نہیں ہوئی۔ پیئر ٹیوٹرنگ کے چند ماہ کے اندر ہی میں کولکاتہ کے ایک سب سے اچھے پرائیویٹ اسکول لوریٹو ایبلیٹ روڈ کے مین اسٹریم (عام دھارے) میں آگئی۔ آج میں ایئر ہوسٹس بننے کا خواب دیکھ رہی ہوں۔ کیونکہ ایک رینبو چائلڈ (طفل قوس قزح) کی حیثیت سے جانتی ہوں کہ (تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے) آسماں اور بھی ہیں۔ اور چوتھی کہانی پولیو کی تھی جس کی بیخ کنی میں ہندوستان کو ایک تاریخی کامیابی ملی ہے اور ابھی ۱۲ فروری کو ہی ہندوستان میں پولیو سے پاک ایک سال پورا ہوا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ یہ کامیابی اس خطرناک مرض کی بیخ کنی میں ہندوستان کی ایک بہت بڑی چھلانگ ضرور ہے، نا امیدی کفر ہے لیکن اس کے باوجود خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ ہندوستان میں پولیو کا وائرس اس کے پڑوسی ممالک سے درآمد نہ ہو جائے کیونکہ دنیا کے جن تین ممالک میں پولیو وبائی صورت میں اب بھی برقرار ہے، وہ نائیجیریا، افغانستان اور پاکستان ہیں اور ۲۰۱۱ء میں پاکستان اور افغانسان میں پولیو کے معاملوں میں تشویشناک حد تک اضافہ دیکھا گیا ہے اور پولیو کا وائرس پاکستان سے دوبارہ چین

اور جب مذہب افیون کی گولی بن جاتا ہے تسلسل

پہنچ گیا ہے جو ۱۹۹۹ء سے پولیو سے پاک تھا۔ ہم اس تقریب سے نکلے تو درد و کرب، ندامت، مایوسی اور امید کی ملی جلی کیفیات و احساسات سے دوچار تھے۔ ہمارے لیے یہ مناظر نہ تو نئے تھے نہ ان سے ہم پہلی بار دوچار ہوئے تھے۔ سچ پوچھئے تو ایسے دردناک مناظر کے درمیان جیتے ہوئے ہم لوگ بے حس ہو چکے ہیں، غریبی اور جہالت ہر دن ہمارے ضمیروں پر ہتھوڑے برساتی ہے لیکن ان دستاویزات نے ان کیفیات کو ایک دم اور ایک ساتھ تازہ کر دیا جن کو ہم لمحے بھر کو بجلی کی آتی جاتی لہروں کی طرح محسوس کرتے اور بھول جاتے ہیں لیکن اصل واقعہ یہ نہیں ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ ہم جلسہ گاہ سے باہر آئے تو ایک صحافی دوست نے جو خیر سے عالم دین بھی ہیں، بڑے رازدارانہ انداز میں مخاطب کیا: 'جاوید صاحب! یہ لوگ ہمارے گھروں میں گھس گھس کر یونہی دوائیں پلاتے پھرتے ہیں کیا'۔ میری سماعتیں جھنجھنا اٹھیں، ایک شاک سا لگا اور کانوں میں سائیں سائیں کے شور کے ساتھ یہ بازگشت گونجنے لگی 'مذہب افیون کی گولی ہے'۔ پاس ہی موجود ایک صحافی کہہ رہا تھا 'اور یہ تو بتایئے کہ مسلم ممالک اور مسلم تنظیمیں مسجد اور مدرسے بنانے اور مسلکی اختلافات کو فروغ دینے کے سوا بھی کچھ کرتی ہیں۔ اور کیا اسلام کے پیغمبر ﷺ نے بچوں کے حقوق کی تعلیم نہیں دی تھی یا اس پر کوئی زور نہیں دیا تھا؟' میرے لیے اس بحث میں پڑنا قابل برداشت نہ تھا۔ ہم ہیبیٹاٹ سینٹر سے باہر آئے تو اردو کے کچھ دوسر صحافی ملے جو دنیا کے بچوں کی حالت ۲۰۱۲ کے اجرا میں دیر سے آنے کی وجہ کانسی ٹیوشن کلب میں ایک پریس کانفرنس کو بتا رہے تھے جو امام مسجد الحرام شیخ سعود الشریم کی آمد کے سلسلے میں بلائی گئی تھی جو اگلے دن نئی دہلی پہنچ رہے تھے۔

اسی تحریر سے

فکر فردا ہم اس جلسہ گاہ سے نکلے تو درد و کرب، ندامت، مایوسی اور امید کی ملی جلی کیفیات و احساسات سے دوچار تھے۔

فکرِ فردا

۔۔۔اور جب برج شاہی بولے گا



احمد جاوید

2025 / 06 / 18

احمد جاوید دبئی ہیں۔دنیا کی بلند ترین عمارت برج الخلیفہ کی تعمیر کے ابھی چند ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ جدہ سے خبر آئی کہ سعودی شاہی خاندان یہاں برج شاہی (کنگڈم ٹاور/برج المملکۃ) کی تعمیر کرانے جارہا ہے جو برج الخلیفہ سے تقریباً دوگنا بلند و بالا ہوگا تو میرے ذہن میں ایک مشہور حدیث کا مفہوم گردش کرنے لگا۔ جی ہاں! آپ نے بالکل درست سمجھا۔ قیامت سے پہلے ننگے پیر ننگے بدن رہنے والے چرواہوں کو دیکھو گے کہ بلند و بالا عمارتوں میں ان میں بازی لگی ہوئی ہے۔ صادق ومصدوق نبیؐ پر ہمارا ایمان اور بھی تازہ ہوگیا۔ شاید آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج دنیائے عرب میں دولت واقتدار جن ہاتھوں میں ہیں ان میں اکثریت کل کے چرواہوں (بدوئوں) کی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ جس وقت روم جل رہا تھا اس کا بادشاہ نیرو بانسری بجارہا تھا۔ آج دنیائے عرب کی جو حالت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، آپ چاہیں تو اس صورت حال کا موازنہ روم اور نیرو سے بھی کرسکتے ہیں لیکن میرے نزدیک مشرق وسطیٰ کی حالت دوسری تیسری صدی عیسوی کے روم سے کہیں زیادہ سنگین اور دھماکہ خیز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دنیا جس وقت قیامت کی چالیں چل رہی ہے، سلاطین عرب میں فلک شگاف عمارتوں کی بازی لگی ہوئی ہے۔ بلند و بالا عمارتیں بنوانے کی روایت دنیا میں نئی نہیں ہے۔ اس کی تاریخ دنیا کی قدیم ترین تہذیب انسانی میں اہرام مصر کی شکل میں ملتی ہے لیکن یہ سلسلہ پچھلی صدی میں نئی شکل میں سامنے آیا جب امریکہ میں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ، سیئرس ٹاور اور ورلڈ ٹریڈ ٹاور کی عمارتیں وجود میں آئیں۔ موخرالذکر کو تو امریکی فخر سے جنت کی سیڑھی کہا کرتے تھے جو نائن الیون کے سانحہ کے ساتھ دنیا کی تاریخ کا ایک المناک ترین باب بن چکا ہے۔ مشرقی ممالک میں یہ رجحان دبئی کے برج العرب اور کوالالمپور کے پیٹرو ناس ٹاور کی تعمیر سے شروع ہوا۔ پچھلے سال برج الخلیفہ نے اب تک کی تمام فلک شگاف عمارتوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ جس کی اونچائی 828 میٹر ہے۔ اس کے بعد تائیوان کے تائپے 101 (508 میٹر)، پھر شنگھائی (چین) کے ورلڈ فنانشل ٹاور (492 میٹر)، اور اس کے بعد ہانگ کانگ کے انٹرنیشنل کامرس سینٹر کی باری آتی ہے جب کہ چند سال پیشتر تک کوالالمپور (ملیشیا) کا پیٹرو ناس ٹاور (452 میٹر) دنیا کی بلند ترین عمارت تھا۔ یہ تفصیلات بتارہی ہیں کہ آج فلک شگاف عمارتیں کس رفتار سے بن رہی ہیں اور مشرقی اقوام میں اس کی کیسی بازی لگی ہوئی ہے۔ جس دنیا میں ہر شب کروڑوں انسان بھوکے سوتے ہوں وہاں یہ عالیشان عمارتیں کیا بتارہی ہیں، کس کی عظمتوں کا خطبہ پڑھ رہی ہیں، کس حقیقت کی آئینہ دار ہیں؟؟ یہ تو وہی بتاسکتے ہیں جو یہ عمارتیں بنوارہے ہیں، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ ان بلندیوں سے زمین پر رینگنے والے انسان یا تو چیونٹیوں سے بھی چھوٹے نظر آتے ہیں یا پھر نظر آتے ہی نہیں۔ دبئی کے شاہی خاندان نے 828 میٹر بلند برج الخلیفہ کی تعمیر کرائی تو اس بلندی کو مات دینے کے لیے سعودی شاہی خاندان اس سے دوگنا بلند و بالا برج شاہی بنوارہا ہے۔ جس وقت یہ خبر ہمارے کانوں میں پڑی میرے ایک صحافی دوست نے کہا دیکھنا یہ برج شاہی عنقریب 'برج رعایا' بن جائے گا۔ لیکن میرے کانوں میں طرابلس کے صدارتی محل سے آنے والی یہ آواز گونج رہی تھی 'کیڑے مکوڑو، کاکروچو اور مینڈکو اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ ورنہ سب کے سب مارے جاؤگے'۔ یہ کسی اور کی نہیں کرنل معمر قذافی کی آواز تھی جو اس وقت اس بلندی پر تھا جہاں سے خلق خدا نظر نہیں آتی یا آتی ہے تو کیڑے مکوڑوں سے بھی حقیر نظر آتی ہے۔ 30 ارب ڈالر کی لاگت سے بننے والا برج شاہی (کنگڈم ٹاور) ایک میل (1.6 کلو میٹر) بلند ہوگا۔ جدہ سے تقریباً 20 کلو میٹر کے فاصلے پر بحر احمر کے ساحل پر واقع یہ بلند و بالا عمارت ایک کروڑ بیس لاکھ مربع فٹ کے وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوگی

---اور جب برج شاہی بولے گا تسلسل

اور اس میں عالیشان ہوٹل، جم، ریستوران، اپارٹمنٹس اور دنیا بھر کی آسائشوں سے مزین شاپنگ سینٹرز ہوں گے۔ جس کی نچلی منزل سے آخری منزل کا سفر بذریعہ لفٹ 20 منٹ کا ہوگا۔ دبئی کے برج الخلیفہ کی بلندی 3281 فٹ ہے جب کہ جدہ کے برج شاہی کی بلندی 5,280 فٹ ہوگی، اس ٹاور کا ڈیزائن بھی اسی امریکی کمپنی نے تیار کیا ہے جس نے برج الخلیفہ کا ڈیزائن تیار کیا تھا۔ ماہرین تعمیرات اس منصوبہ کی تنقید کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی سب سے اونچی عمارت بنانے کی جو بازی لگی ہوئی ہے وہ خطرناک ہے۔ عالمی جریدہ دی آرکیٹیکٹس جرنل کے ایڈیٹر روزی آلکاٹو نے اس کو فضول کی مقابلہ آرائی کہا ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ یہ بازی جو لگ گئی ہے تو کہنا مشکل ہے کہ کہاں جا کر ٹھہرے گی۔ ہم نے بچپن میں پڑھا تھا: المنارۃ تتحدث (منارہ بولتا ہے)۔ یہ ساتویں جماعت میں عربی کی درسی کتاب القرأۃ الراشدہ کا پہلا سبق تھا۔ کتاب کے مؤلف مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مضمون میں ہندوستان کی تاریخ بیان کی ہے، دہلی کا قطب مینار بچوں کو ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے عروج وزوال کی کہانی سنا رہا ہے۔ یہ کہانی بہت ہی دلچسپ، رقت انگیز اور عبرتناک ہے۔ دہلی کا قطب مینار بیان کر رہا ہے کہ کس طرح سرزمین ہند پر مسلمانوں کے قافلے اترے اور کس طاقت نے انہیں یہاں سرخ روئی و سربلندی عطا کی۔ پھر کیوں، کس طرح اور کن ہاتھوں سے وہ ذلیل وخوار ہوئے۔ انگریزوں کے ہاتھوں پلاسی اور بکسر کی جنگوں میں مسلمانوں کی شکستوں کی دلدوز کہانیاں سناتے وقت منارے کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ منارہ بتاتا ہے کہ جس وقت سلطنت مغلیہ کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا، ہندوستان کے ہندو مسلمان، راجے، مہاراجے، نوابین، جاگیرداران اور امرائے سلطنت کیا کر رہے تھے۔ کاش! آج کے یہ سلاطین مسلم سمجھ پاتے کہ منارے بھی بولتے ہیں اور بروج (ٹاورز) بھی کہانیاں سناتے ہیں۔ کاش! ان کے دل کی آنکھیں اندھی نہ ہوگئی ہوتیں اور یہ دیکھ پاتے کہ ان میناروں کی آنکھوں میں کس طرح خون کے آنسو تیر رہے ہیں، جو ان کے سروں پر کھڑے ہیں یا جن کی بلندیوں پر ان کے دماغ ہیں۔ ان ہی کالموں میں ہم پہلے بھی آپ سے عرض کر چکے ہیں کہ دنیائے عرب کی سیاسی و سماجی صورت حال تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہی ہے لیکن مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے حکمرانوں کی سمجھ سے باہر ہے کہ وہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر کیا کریں۔ صحرائے عرب میں تعمیر کیے جانے والے ان میناروں (ٹاورز) پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مغربی مبصر نے بڑی خدا لگتی بات کہی ہے کہ یہ اس سوچ کی علامت ہیں جس کی جڑیں عہد وسطیٰ میں پیوست ہیں۔ بلاشبہ یہ سلاطین عرب آج بھی عہد وسطیٰ میں جی رہے ہیں۔ دنیائے عرب کو آج سیاسی، سماجی اور جغرافیائی اعتبار سے تین حصوں میں بانٹ کر دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلا جزیرۃ العرب کا وہ علاقہ جہاں سعودی عرب، عراق، کویت، یمن اور عرب امارات ہیں، اس خطے میں انقلاب کی لہریں بہ ظاہر زیادہ طاقتور نظر نہیں آتی ہیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ یہاں زمینوں کے نیچے کتنا لاوا ابل رہا ہے۔ تیل کی دولت اور جبر واستبداد کی قوتوں سے دبی انقلابی طاقتیں کس دن آتش فشاں بن جائیں، کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن ان ملکوں کی دینی اور سیاسی قیادتیں یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دوسرے حصے میں دنیائے عرب کے قدیم تہذیبی وثقافتی مراکز واقع ہیں۔ مصر، شام، فلسطین اور اردن۔ اسی خطے میں دنیائے اسلام کا سب سے حساس فلیش پوائنٹ بیت المقدس اور صیہونیت کا ناسور اسرائیل ہے۔ عرب قوم پرستی کا میدان عمل شروع سے یہی خطہ رہا ہے اور یہاں نسبتاً زیادہ سیاسی بیداری ہے۔ تیسرا حصہ مغرب کا علاقہ ہے جو مراقش، لیبیا، تیونس، موریطانیہ اور شمالی افریقہ کے دوسرے ممالک پر مشتمل ہے۔ جہاں یوروپ اور صوفیا کے اثرات کے باعث جمہوریت کی جڑیں اور انقلابی فکر کافی مضبوط ہیں اور آج ان دونوں خطے میں کس طرح حکمراں اور عوام آمنے سامنے کھڑے ہیں اور اس ٹکراؤ کا فائدہ اٹھانے کی کیسی سازشیں بیرونی طاقتیں کر رہی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ کاش! ان حکمرانوں کی آنکھیں ہوتیں جو اس عالم میں بھی فلک شگاف عمارتوں کی تعمیر کی بازی میں لگے ہوئے ہیں۔ کاش! ان کے کان ہوتے وہ سن پاتے اور کاش! ان کے دل ہوتے جو یاد رکھتے کہ منارے بھی بولتے ہیں۔

فکرِ فردا

چاند پر چاندنی چوک: باباجی، بی جے پی اور کانگریس



احمد جاوید

2011 / 05 / 06

احمد جاوید یہ 1993 کا واقعہ ہے، جولائی کی کوئی تاریخ تھی، وہ جے این یو میں داخلہ کے لئے دہلی آیا تھا۔ آج تقریباً 20 سال بعد اس کی ڈائری کا یہ ورق میری یادداشت میں گردش کر رہا ہے۔ اس نے لکھا تھا۔ "آدھی رات کو ٹرین سے نئی دہلی جنکشن پر اترا۔ باہر آیا تو ایک طرف کاروں کی قطاریں اور دوسری طرف تانگوں اور رکشوں کی آمد و رفت نظر آئی۔ روشنی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی لیکن اس میں جو چیز سب سے نمایاں تھی وہ شہر کے حکیموں کے بڑے بڑے ہورڈنگ تھے، جدھر نظر اٹھایئے، خاندانی شفاخانہ، سب لوک فارمیسی، حکیم ہرکشن لال وغیرہ، ابھی ہمیں صبح کا انتظار کرنا تھا۔ صبح ذرا روشن ہوئی تو ایک بار پھر باہر آئے، ابھی تک ہم فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ پہلے کہاں جائیں، گومگو کے عالم میں کانوں میں پڑنے والی پہلی آواز (پرانی دہلی، چاندنی چوک، فوارے) نے اپنی جانب کھینچ لیا اور ہم ایک خوبصورت تانگے میں بیٹھ گئے جس کے کوچوان کی طرح اس کا گھوڑا بھی جوان اور شہ زور تھا۔ خیال تھا کہ صبح کی اس سہانی ساعت میں شہر کے دیوار و در دیکھتے جائیں گے، وہ بھی دیکھا لیکن جدھر نظر اٹھایئے ادھر وہی ہورڈنگز یہاں تک کہ سڑکوں کے درمیان بجلی کے کھمبے بھی تاحد نگاہ سب لوک فارمیسی، خاندانی شفاخانہ اور حکیم ہرکشن لال کے چھوٹے بڑے ہورڈنگز سے مزین۔ اجمیری گیٹ، نیا بازار، پیلی کوٹھی، موری گیٹ، پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن اور پھر چاندنی چوک، یہاں تو یہ نظارہ نگاہوں کو اور بھی خیرہ کر رہا تھا۔ کئی کثیر منزلہ عمارتیں اوپر سے نیچے تک مایوس مریضوں کا شرطیہ علاج کرنے والے حکیموں اور ویدوں کے ہورڈنگز سے مزین تھیں۔ خیال ابھرا کہ یہ ہندوستان کی راجدھانی ہے یا ملک کا دارالشفا، معاً ایک اور سوال ذہن کے کینوس پر چھا گیا 'آیا یہ ملک نامردوں 'بے اولادوں اور امراض خبیثہ میں مبتلا مایوسوں کا دیس ہے ؟ ان حکیموں اور ویدوں کی تشہیر کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ ان کے پاس کتنی دولت ہے یا ان کا کاروبار کتنا بڑا ہے۔" دہلی کے ایک نووارد نوجوان کی ڈائری کے اس ورق کو ایک بار پھر پڑھ جائیں اور کسی دن نئی دہلی 'پرانی دہلی 'کناٹ پلیس، چاندنی چوک اور شہر کے دوسرے کوچہ و بازار کی سیر کو نکلیں، غور کریں کہ ان حکیموں اور ویدوں کے وہ بڑے بڑے ہورڈنگز اب کہاں چلے گئے، کیا انہوں نے اپنی دکانیں سمیٹ لیں یا پھر وہ سب کے سب صحت مند ہو گئے جو ان کے مریض تھے ؟ نہ تو ان حکیموں، ویدوں اور شعبدہ باز بابائوں نے اپنی دکانیں سمیٹی ہیں اور نہ ان کے مریضوں میں کمی آئی ہے، دونوں کی تعداد میں وقت کے ساتھ کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے لیکن آپ کو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ پوسٹر اور ہورڈنگز کب شہر کی دیواروں سے اٹھ کر ٹی وی کے پردوں تک پہنچ گئے، سٹیلائٹ چینلوں کی آمد کے ساتھ ان کا بزنس کتنا ہائی ٹیک ہو گیا، کب ہمارا چاندنی چوک چاند پر پہنچ گیا جہاں سے یہ نیم حکیم اور یہ شعبدے باز گھر گھر میں اتر رہے ہیں، لوگوں کی ضعیف الاعتقادی اور توہمات کا استحصال کر رہے ہیں۔ اس وقت بابا رام دیو کو بعض لوگ آر ایس ایس کا ایجنٹ کہہ رہے ہیں، بعض مبصرین ان کی پیٹھ پر بی جے پی کی منصوبہ بندی بتا رہے ہیں اور کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کانگریس کے آلہ کار ہیں، لیکن میرے ذہن میں بار بار ایک ہی بات گردش کر رہی ہے۔ وہ چاہے کچھ بھی ہوں، کسی کے بھی ایجنٹ اور آلہ کار ہو سکتے ہیں، حقیقت میں تو وہ ایک شعبدہ باز ہیں۔ ہریانہ کے ایک افتادہ و پسماندہ گائوں کا رام دیو یادو یوگا کے کرتب اور شمشان کی بھبھوت کے ساتھ چاندنی چوک کے حکیموں کی طرح کب چاند پر پہنچ گیا، اس کے قریبی ساتھیوں کو بھی اب یاد نہیں ہو گا۔ یہ مصنوعی چاند (سیارچہ) کا جلوہ ہے جس نے شمشان کی بھبھوت بیچنے اور یوگا کی مارکیٹنگ کرنے والے شعبدہ بازوں کو راتوں رات کروڑوں میں کھیلنے کی صلاحیت بخش دی ہے۔ کل تک ان کے چاہنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہوتی تھی آج لاکھوں کروڑوں میں ہے اور

چاند پر چاندنی چوک: بابا جی، بی جے پی اور کانگریس متسلل

دنیا کے مختلف حصوں میں ہے۔ بد قسمتی سے ہندوستان کی سیاسی برادری ان کی سب سے بڑی خریدار ہے۔ بابا رام دیو جمعرات کو جب دہلی ایئرپورٹ پر اترے تو ان کے استقبال میں مرکزی وزراء کھڑے تھے، اگلے دن ان کی ملاقات نئی دہلی کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں ہوئی اور سب کچھ طے پا گیا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اس تماشہ پر کروڑوں روپے لگا چکے تھے۔ بھرشٹا چار سے لڑنے کے نام پر کروڑوں روپے کی سرمایہ کاری کی گئی تھی تاکہ ملک وبیرون ملک کا میڈیا چوبیسوں گھنٹے بابا کی ستیہ گرہ دنیا کے گوشے گوشے میں دکھائے۔ دو کروڑ کے واٹر پروف پنڈال، 9 بڑے بڑے اسکرین، 800 پنکھے، 100 کولر، سوا دو کروڑ کے ٹینٹ، ستیہ گرہ میں شریک ہزاروں افراد کے لئے کپڑے، رات کو آرام کی خاطر گدے، 80 کروڑ کی لاگت سے پانی کا آر او سسٹم، سائونڈ کا بہترین انتظام، جلسہ گاہ کے الگ الگ بلاکوں میں 750 ٹونٹیاں، دن رات روشنی کا خصوصی بندوبست، 500 سے زائد بیت الخلا، 1000 غسل خانے، ملک بھر میں اس ستیہ گرہ کے پرچار، جھنڈے، ڈنڈے اور بینروں پر 18 کروڑ روپے کا صرفہ، دو سو مزدوروں نے دو ہفتے دن رات ایک کرکے رام لیلا میدان کو تیار کیا تھا۔ خرچ کا تخمینہ 30 کروڑ سے اوپر ہے۔ کیا اتنی دولت پانی کی طرح صرف اس لئے بہائی جارہی تھی کہ بابا جی رام لیلا میدان میں اتریں، شنکھ بجاکر ستیہ گرہ کا آغاز کریں اور پھر منانے پر اٹھ کر اپنے آشرم کو چلے جائیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ ان بابائوں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آرہی ہے اور ان کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کررہا ہے تو کیونکر؟ کام چاہے کتنا ہی اچھا ہو، اس کا اصل دارومدار نیت پر ہوتا ہے اور آپ کی آنکھیں اور آپ کی پیشانیاں وہ آئینہ ہیں جو اکثر آپ کی نیتوں کو طشت از بام کردیتی ہیں، بابا رام دیو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس وقت وہ منموہن حکومت اور اس کے وزراء کو برا بھلا کہہ رہے ہیں، کہہ رہے ہیں کہ ان کے خط کو مشتہر کرکے حکومت نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے لیکن عام آدمی چاہے اپنی سادہ لوحی کے باعث مبہوت ہو اور توہمات کے شکار افراد خواہ ان کے بلند آہنگ دعوئوں پر دل وجان سے فدا ہوں، سیاسی کھلاڑیوں نے تو ان کی نیت روز اول ہی بھانپ لی تھی اور ان میں بابا جی کے کندھے پر سیاست کی سواری کرنے کی دوڑ شروع ہوگئی تھی۔ بی جے پی اور آر ایس ایس کی جانب بابا جی کا فطری جھکائو تھا، سنگھ نے اپنے لاکھوں سویم سیوکوں کو بابا کی تحریک میں کود پڑنے کا حکم دے دیا، بی جے پی پوری طاقت کے ساتھ ان کی پیٹھ پر کھڑی ہوگئی تاکہ حکومت کے خلاف ماحول بنایا جاسکے۔ دوسری جانب کانگریس بھی تھوڑے سے ٹکرائو کے بعد بابا پر ڈورے ڈالنے میں مصروف تھی، وہ رام لیلا میدان میں ستیہ گرہ پر بیٹھنے کے ارادے سے دہلی پہنچے تو ایئرپورٹ پر ان کے خیر مقدم میں مرکزی وزیر کپل سبل، سبودھ کانت سہائے اور پرنب مکھرجی یوں ہی نہیں کھڑے تھے۔ اگلے دن نئی دہلی کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں ان کی خفیہ ملاقات ہوئی، معاہدہ ہوا اور طے پا گیا کہ اب وہ 'یوگا' ووگا کرکے جلد ہی اس تماشے کو ختم کردیں گے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ 'وناش کالے وپریت بدھی'، وہ بھول گئے کہ جن سے ان کو پالا پڑا ہے وہ ان سے بھی بڑے شعبدہ باز ہیں۔ رام لیلا میدان میں ان کا دھرنا شروع ہوا تو ایک طرف تو وہ اپنے چاہنے والوں کو دھرنے پر چھوڑ کر اپنے آرام دہ خیمہ کے پچھلے دروازے سے وزیر اعظم اور ان کے نمائندوں سے مل رہے تھے اور دوسری جانب حکومت کے خلاف نعرے بھی بلند کررہے تھے۔ شاستری بھون میں اپنے دفتر کے ٹی وی سیٹ پر کپل سبل اور سبودھ کانت سہائے کے لئے بابا کا تیور دیکھنا ناقابل برداشت تھا، ان کے دوسرے ساتھی ان سے پوچھ رہے تھے کہ جب معاملہ طے ہوگیا تو یہ تماشہ کیا ہے؟ پھر کیا تھا، بابا کی چٹھی میڈیا میں آگئی۔ جس میں لکھا تھا کہ حکومت کی تحریری یقین دہانی پر راضی ہونے کے بعد اب بابا بھوک ہڑتال نہیں بلکہ 4 سے 6 جون تک رام لیلا میدان میں تپ کریں گے۔ دھرنا شروع کرنے سے دو دن پہلے جمعہ کو لکھی گئی اس چٹھی میں یہ بھی تھا کہ حکومت کے ساتھ اتفاق ہوجانے کا اعلان خود بابا رام دیو سینچر تک کردیں گے۔ اب بابا بھی بوکھلا چکے تھے اور ان کی پیٹھ پر کھڑی بی جے پی بھی بوکھلاہٹ میں اپنا سر نوچ رہی تھی۔ حکومت کو چیلنج کررہی تھی کہ اس میں ہمت ہے تو بابا رام دیو کو گرفتار کرکے دکھائے۔ ظاہر ہے کہ وہ ٹکرائو بڑھانا چاہتی تھی۔

چاند پر چاندنی چوک: باباجی، بی جے پی اور کانگریہ متسلل

دہلی پولس نے آدھی رات کو رام لیلا میدان میں ان کی خواب گاہ پر چھاپہ مار کر انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا، رام لیلا میدان میں اجتماع کی اجازت رد کر دی اور صبح ہونے سے پہلے ہری دوار پہنچادیا۔ بھرشٹاچار کے خلاف تیس کروڑ کی ہائی ٹیک ستیا گرہ کا یہ انجام کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں رہا ہوگا۔ اس وقت تک تو سارا کھیل بابا کے منصوبہ اور توقع کے عین مطابق چل رہا تھا جب اتوار کی رات ایک بجے دہلی پولس نے رام لیلا میدان پر شب خوں مارا تھا اور بابا عورتوں کا لباس پہن کر ان میں گم ہو گئے تھے۔ ہر طرف شور تھا کہ اب بابا 'ادرشیہ' (ناقابل دید) ہو گئے ہیں۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اگر اگلے دن اسی مقام پر اچانک وہ گیروے لبادے میں واپس آجاتے تو آج 'یوگا' کا یہ کرشمہ کتنے بڑے پیمانے پر کیش کیا جارہا ہوتا۔ خیر گذری کہ صبح ہونے سے پہلے پولس نے ان کو زنانہ شلوار قمیص میں برآمد کر لیا۔ بہ غور دیکھیں تو یہ اس ملک کی ایک ٹریجڈی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہم شعبدہ بازوں کے شکار ہیں۔ مذہب اور سیاست میں تو اور بھی زیادہ۔ بے چارہ عام آدمی کیا کرے جو چاندنی چوک میں اس نووارد کی طرح کھڑا ہے جو حیران تھا کہ ان نیم حکیموں اور شعبدہ بازوں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آتی ہے۔

اسی تحریر سے

احمد جاوید یہ 1993 کا واقعہ ہے، جولائی کی کوئی تاریخ تھی، وہ جے این یو میں داخلہ کے لئے دہلی آیا تھا۔

فکرِ فردا

بابا جی، بی جے پی اور کانگریس



احمد جاوید

2025 / 06 / 18

احمد جاوید یہ 1993 کا واقعہ ہے، جولائی کی کوئی تاریخ تھی، وہ جے این یو میں داخلہ کے لئے دہلی آیا تھا۔ آج تقریباً 20 سال بعد اس کی ڈائری کا یہ ورق میری یادداشت میں گردش کر رہا ہے۔ اس نووارد لڑکے نے لکھا تھا۔ "آدھی رات کو ٹرین سے نئی دہلی جنکشن پر اترا۔ باہر آیا تو ایک طرف کاروں کی قطاریں اور دوسری طرف تانگوں اور رکشوں کی آمدورفت نظر آئی۔ روشنی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی لیکن جو چیز سب سے زیادہ متوجہ کر رہی تھی وہ شہر کے حکیموں کے بڑے بڑے ہورڈنگ تھے، جدھر نظر اٹھایئے، قد آدم تصویروں سے مزین ہورڈنگز، خاندانی شفاخانہ، سب لوک فارمیسی، حکیم ہرکشن لال وغیرہ، ابھی ہمیں صبح کا انتظار کرنا تھا۔ صبح ذرا روشن ہوئی تو ایک بار پھر باہر آئے، ابھی تک ہم فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ پہلے کہاں جائیں، گومگو کے عالم میں کانوں میں پڑنے والی پہلی آواز پرانی دہلی، چاندنی چوک، فوارے نے اپنی جانب کھینچ لیا اور ہم ایک خوبصورت تانگے میں بیٹھ گئے جس کے کوچوان کی طرح اس کا گھوڑا بھی جوان اور شہ زور تھا۔ خیال تھا کہ صبح کی اس سہانی ساعت میں شہر کے دیوار ودر دیکھتے جائیں گے، وہ بھی دیکھا لیکن جدھر نظر اٹھایئے ادھر وہی ہورڈنگز یہاں تک کہ سڑکوں کے درمیان بجلی کے کھمبے بھی تاحد نگاہ سب لوک فارمیسی، خاندانی شفاخانہ اور حکیم ہرکشن لال کے چھوٹے بڑے ہورڈنگز سے مزین۔ اجمیری گیٹ، نیا بازار، پیلی کوٹھی، موری گیٹ، پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن اور پھر چاندنی چوک، یہاں تو یہ نظارہ نگاہوں کو اور بھی خیرہ کر رہا تھا۔ کئی کثیر منزلہ عمارتیں اوپر سے نیچے تک امراض مردانہ وزنانہ اور دوسری بیماریوں کا شرطیہ علاج کرنے والے حکیموں اور ویدوں کے ہورڈنگز سے مزین تھیں۔ ذہن میں یہ خیال بڑی شدت سے ابھرا کہ یہ ہندوستان کی راجدھانی ہے یا ملک کا دارالشفا، معاً ایک اور سوال ذہن کے کینوس پر چھا گیا' آیا یہ ملک نامردوں' بے اولادوں اور امراض خبیثہ میں مبتلا لوگوں کا ہے؟ ان حکیموں اور ویدوں کی تشہیر کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ ان کے پاس کتنی دولت ہے یا ان کا کاروبار کتنا بڑا ہے۔" دہلی کے ایک نووارد نوجوان کی ڈائری کے اس ورق کو ایک بار پھر پڑھ جائیں اور کسی دن نئی دہلی' پرانی دہلی' کناٹ پیلس، چاندنی چوک اور شہر کے دوسرے کوچہ وبازار کی سیر کو نکلیں، غور کریں کہ ان حکیموں اور ویدوں کے وہ بڑے بڑے ہورڈنگز اب کہاں چلے گئے، کیا انہوں نے اپنی دکانیں سمیٹ لیں یا پھر وہ سب کے سب صحت مند ہو گئے جو ان کے مریض تھے؟ نہ تو ان حکیموں، ویدوں اور شعبدہ باز بابائوں نے اپنی دکانیں سمیٹی ہیں اور نہ ان کے مریضوں میں کمی آئی ہے، دونوں کی تعداد میں وقت کے ساتھ کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے لیکن آپ کو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ پوسٹر اور ہورڈنگز کب شہر کی دیواروں سے اٹھ کر ٹی وی کے پردوں تک پہنچ گئے، سٹیلائٹ چینلوں کی آمد کے ساتھ ان کا بزنس کتنا ہائی ٹیک ہو گیا، کب ہمارا چاندنی چوک چاند پر پہنچ گیا جہاں سے یہ نیم حکیم اور یہ شعبدے باز گھر گھر میں اتر رہے ہیں۔ جو لوگ کل تک چاندنی چوک میں دوائیں بیچتے تھے وہ اب ٹی وی چینلوں پر شعبدے دکھا رہے ہیں، دوائیں بیچ رہے ہیں، لوگوں کے اعتقاد اور توہمات کا استحصال کر رہے ہیں۔ اس وقت بابا رام دیو کو بعض لوگ آر ایس ایس کا ایجنٹ کہہ رہے ہیں، بعض مبصرین ان کی پیٹھ پر بی جے پی کی منصوبہ بندی بتا رہے ہیں اور کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کانگریس کے آلہ کار ہیں۔ وہ بھرشٹاچار کے خلاف دوسرے قدر آور سماجی کارکنوں کے ذریعہ چھیڑی گئی جنگ کی ہوا نکالنا چاہتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے مبصرین کا خیال ہے کہ پہلے تو بابا نے آر ایس ایس اور بی جے پی کے ساتھ مل کر حکومت کو گھیرنے کا کھیل شروع کیا لیکن جب کانگریس کے لیڈروں' منموہن حکومت کے وزیروں اور اعلیٰ افسران نے بابا کی خدمت میں دوڑ لگائی تو پھر وہ کانگریس کی گود میں کھیلنے لگے۔ آپ

بابا جی، بی جے پی اور کانگریہ تسلسل

جو چاہیں کہیں لیکن میرے ذہن میں بار بار ایک ہی بات گردش کر رہی ہے۔ وہ چاہے کچھ بھی ہوں، کسی کے بھی ایجنٹ اور آلہ کار ہو سکتے ہیں، حقیقت میں وہ ایک شعبدہ باز ہیں۔ ہریانہ کے ایک گاؤں کا رام دیو یادو یوگا کے کرتب اور شمشان کی بھبھوت کے ساتھ چاندنی چوک کے حکیموں کی طرح کب چاند پر پہنچ گیا، اس کے قریبی ساتھیوں کو بھی اب یاد نہیں ہوگا۔ یہ مصنوعی چاند (سیارچہ) کا جلوہ ہے جس نے چاندنی چوک کے حکیموں کی طرح شمشان کی بھبھوت بیچنے اور یوگا کی مارکیٹنگ کرنے والے شعبدہ بازوں کو راتوں رات کروڑوں میں کھیلنے کی صلاحیت بخش دی ہے۔ کل تک ان کے چاہنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہوتی تھی آج لاکھوں کروڑوں میں ہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان کی سیاسی برادری ان کی سب سے بڑی خریدار ہے۔ بابا رام دیو جب دہلی ایئرپورٹ پر اترے تو ان کے استقبال میں مرکزی وزراء کھڑے تھے جنہوں نے ان کو منانے کی کوشش کی، اگلے دن ان کی ملاقات نئی دہلی کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں ہوئی۔ بابا کے جملہ مطالبات مان لئے گئے اور وہ بھی مان گئے۔ کیوں نہ مان لیتے کہ ان کی خدمت میں حکومت ہند خود سر کے بل کھڑی تھی، مرکزی وزرا کپل سبل، سبودھ کانت سہائے، اور پرنب مکھرجی تک ڈنڈوت تھے۔ لیکن اس کی مشکل یہ تھی کہ وہ اس تماشہ پر کروڑوں روپے لگا چکے تھے۔ بھرشٹاچار سے لڑنے کے نام پر کروڑوں روپے کی سرمایہ کاری کی تھی۔ 30 کروڑ روپئے کی لاگت سے تو صرف رام لیلا میدان کو سجایا گیا تھا تاکہ ملک وبیرون ملک کا میڈیا چوبیسوں گھنٹے بابا کی ستیہ گرہ دنیا کے گوشے گوشے میں دکھائے۔ دو کروڑ کے واٹر پروف پنڈال، 9 بڑے بڑے اسکرین، 800 پنکھے، 100 کولر، سوا دو کروڑ کے ٹینٹ، ستیہ گرہ میں شریک ہزاروں افراد کے لئے رات کو آرام کی خاطر گدے، 80 کروڑ کی لاگت سے پانی کا آر او سسٹم، سائونڈ کا بہترین انتظام، جلسہ گاہ کے الگ الگ بلاکوں میں 750 ٹونٹیاں اور دن رات روشنی کا خصوصی بندوبست، 500 سے زائد بیت الخلا، 1000 غسل خانے، ملک بھر میں اس ستیہ گرہ کے پرچار، جھنڈے، ڈنڈے اور بینروں پر 18 کروڑ روپے کا صرفہ دو سو مزدوروں نے دو ہفتے دن رات ایک کر کے رام لیلا میدان میں اتنا بڑا انفرا اسٹرکچر تیار کیا تھا۔ کیا اتنی دولت پانی کی طرح صرف اس لئے بہائی جا رہی تھی کہ بابا جی رام لیلا میدان میں اتریں، شنکھ بجا کر ستیہ گرہ کا آغاز کریں اور پھر منموہن حکومت کے منانے پر اٹھ کر اپنے آشرم کو چلے جائیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ ان بابائوں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آ رہی ہے اور ان کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کیوں کر رہا ہے؟ کام چاہے کتنا ہی اچھا ہو، اس کی کامیابی وناکامی کا اصل دارومدار نیت پر ہوتا ہے، ویسے تو نیتوں کا حال خدا ہی جانتا ہے، بدگمانی اچھی چیز نہیں لیکن آپ کی زبان، آپ کی آنکھیں اور آپ کی پیشانیاں وہ آئینہ ہیں جو اکثر آپ کی نیتوں کو طشت از بام کر دیتی ہیں، بابا رام دیو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس وقت وہ منموہن حکومت اور وزیر فروغ انسانی وسائل کپل سبل کو برا بھلا کہہ رہے ہیں، کہہ رہے ہیں کہ ان کے خط کو مشتہر کر کے حکومت نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے لیکن عام آدمی چاہے اپنی سادہ لوحی کے باعث مبہوت ہو، توہمات کے شکار افراد خواہ ان کے بلند آہنگ دعوئوں پر دل وجان سے فدا ہوں، سیاسی کھلاڑیوں نے تو ان کی نیت روز اول ہی بھانپ لی تھی۔ اور ان میں بابا جی کے کندھے پر سیاست کی سواری کرنے کی دوڑ شروع ہوگئی تھی۔ بی جے پی اور آر ایس ایس جن کی جانب بابا جی کا فطری جھکائو تھا، سب پر سبقت لے جانا چاہتی تھی، سنگھ نے اپنے لاکھوں سویم سیوکوں کو بابا کی تحریک میں کود پڑنے کا حکم دے دیا، بی جے پی پوری طاقت کے ساتھ ان کی پیٹھ پر کھڑی ہوگئی تاکہ حکومت کے خلاف ماحول بنایا جا سکے۔ دوسری جانب کانگریس بھی تھوڑے سے ٹکرائو کے بعد بابا پر ڈورے ڈالنے میں مصروف تھی، پہلے انفورسمنٹ کے افسران ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر وزیروں نے حاضری دی، دبائو بنانے کی کوشش کی، ڈرایا، لالچ دیا، سمجھایا بجھایا اور آخر کار شیشہ میں اتار لیا۔ وہ رام لیلا میدان میں ستیہ گرہ پر بیٹھنے کے ارادے سے دہلی پہنچے تو ایئرپورٹ پر ان کے خیر مقدم میں مرکزی وزیر کپل سبل، سبودھ کانت سہائے اور پرنب مکھرجی یوں ہی نہیں کھڑے تھے۔ اگلے دن نئی دہلی کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں ان کی خفیہ

بابا جی، بی جے پی اور کانگریس تسلسل

ملاقات ہوئی، معاہدہ ہوا اور طے پا گیا کہ اب وہ 'یوگا' ووگا کر کے جلد ہی اس تماشے کو ختم کر دیں گے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے، وہ بھول گئے کہ جن سے ان کو پالا پڑا ہے وہ ان سے بھی بڑے شعبدہ باز ہیں۔ رام لیلا میدان میں ان کا دھرنا شروع ہوا تو ایک طرف تو وہ اپنے چاہنے والوں کو دھرنے پر چھوڑ کر اپنے آرام دہ خیمہ کے پچھلے دروازے سے وزیر اعظم اور ان کے نمائندوں سے مل رہے تھے اور دوسری جانب حکومت کے خلاف نعرے بھی بلند کر رہے تھے۔ شاستری بھون میں اپنے دفتر کے ٹی وی سیٹ پر کپل سبل اور سبودھ کانت سہائے کے لئے بابا کا یہ کھیل دیکھنا ناقابل برداشت تھا، ان کے دوسرے ساتھی ان سے پوچھ رہے تھے کہ جب سودا طے ہو گیا تو یہ کیا تماشہ ہے؟ پھر بابا کی چٹھی میڈیا میں آ گئی۔ جس میں لکھا تھا کہ حکومت کی تحریری یقین دہانی پر راضی ہونے کے بعد اب بابا بھوک ہڑتال نہیں بلکہ 4 سے 6 جون تک رام لیلا میدان میں تپ کریں گے۔ دھرنا شروع کرنے سے دو دن پہلے جمعہ کو لکھی گئی اس چٹھی میں یہ بھی تھا کہ حکومت کے ساتھ اتفاق ہو جانے کا اعلان خود بابا رام دیو سنیچر تک کر دیں گے۔ اب بابا بھی بوکھلا چکے تھے اور ان کی پیٹھ پر کھڑی بی جے پی بھی بوکھلاہٹ میں اپنا سر نوچ رہی تھی۔ حکومت کو چیلنج کر رہی تھی کہ اس میں ہمت ہے تو بابا رام دیو کو گرفتار کر کے دکھائے۔ دہلی پولس نے آدھی رات کو رام لیلا میدان میں ان کی خواب گاہ پر چھاپہ مار کر انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا، رام لیلا میدان میں اجتماع کی اجازت رد کر دی اور صبح ہونے سے پہلے ہری دوار پہنچا دیا۔ بھرشٹاچار کے خلاف تیس کروڑ کی ہائی ٹیک ستیا گرہ کا یہ انجام کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں رہا ہو گا۔ بہ غور دیکھیں تو یہ اس ملک کی ایک ٹریجڈی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہم شعبدہ بازوں کے شکار ہیں۔ مذہب اور سیاست میں تو اور بھی زیادہ۔ بے چارہ عام آدمی کیا کرے جو چاندنی چوک میں اس نووارد لڑکے کی طرح کھڑا ہے جو حیران تھا کہ ان نیم حکیموں اور شعبدہ بازوں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آتی ہے۔

اسی تحریر سے

احمد جاوید یہ 1993 کا واقعہ ہے، جولائی کی کوئی تاریخ تھی، وہ جے این یو میں داخلہ کے لئے دہلی آیا تھا۔

فکرِ فردا

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا؟ دنیائے عرب کا عوامی انقلاب



احمد جاوید

2025 / 06 / 18

احمد جاوید اس وقت شام میں جبر واستبداد کے خلاف سڑکوں پر اترنے والوں کی پیاس گولیوں سے بجھائی جارہی ہے، یمن اور بحرین کے حالات دھماکہ خیز ہیں، لیبیا کے سرکاری تنصیبات پر ناٹو کی بمباری تیز سے تیز تر کردی گئی ہے، اس کے 8 بحری بیڑے سمندر میں غرق کردیئے گئے، فوجی تنصیبات اور دفاتر تباہ کیے جارہے ہیں اور امریکہ کہہ رہا ہے کہ قذافی کو ہر حال میں اقتدار چھوڑنا پڑے گا لیکن دوسری جانب ضد ہی ضد اور للکار ہی للکار ہے۔ کہا جارہا ہے کہ ابامہ ابھی تک وہم میں مبتلا ہیں اور یہ ان کی خام خیالی ہے کہ قذافی کی اقتدار سے معزولی نوشتہ دیوار بن چکی ہے۔ اپنے ہی بھائیوں کو بموں، بندوقوں اور میزائلوں کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ ایسے میں یہ سوال زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ کیا مشرق وسطیٰ کا یہ انقلاب اسلام کے حق میں ہے؟ بریان ڈائی سن دنیا کی ایک سب سے بڑی مشروبات ساز کمپنی کا سربراہ (چیف ایگزیکٹیو) ہے۔ پچھلے دنوں اس نے اپنی کمپنی کے اہلکاروں سے خطاب کیا تھا جس کو دنیا کی مختصر ترین جامع تقریر قرار دیا گیا۔ ڈائی سن نے کہا تھا: کام، خاندان، صحت، دوست اور روح پانچ گیندیں ہیں جن کو ہم لوگ سرکس کے کھلاڑی کی طرح بیک وقت ہوا میں اچھالتے اور پکڑتے رہتے ہیں لیکن پھر زندگی کے ایک حصے میں جاکر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کام ربڑ کی گیند ہے جب کہ باقی چار گیندیں شیشے کی ہیں اور یہ اگر ایک بار گر جائیں تو ٹوٹ جاتی ہیں یا ان میں دراڑ آجاتی ہے یا پھر کسی زاویہ سے دب جاتی ہیں۔ یہ غور دیکھیں تو مشرق وسطیٰ کی تاریخ اپنے آپ کو بار بار دوہرا رہی ہے۔ جن حکمرانوں کے خلاف اس وقت عرب اور افریقی ممالک میں عوامی انقلاب برپا ہے، یہ سب کے سب انقلاب کی پیداوار تھے۔ یہ چاہتے تو اپنی قوموں کے ہیرو بن جاتے، رہتی دنیا تک اچھے ناموں سے یاد کیے جاتے لیکن انہوں نے پانچ گیندوں میں سے ایک ربڑ کی گیند کو ہی سب کچھ سمجھ لیا، اسی پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں ساری توانائی لگادی، بقیہ چار گیندیں جو نازک بھی تھیں اور چکنی بھی ان پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ان کے ساتھ بے دریغ کھلواڑ کرتے رہے۔ نہ یہ سمجھا کہ ملک و قوم حکمرانوں کے خاندان ہوتے ہیں، نہ افراد اور قوم کی صحت پر توجہ دی، نہ دوستوں کی قدر کی، نہ ان کے نیک مشورے مانے حتی کہ خود اپنے ضمیر کی آواز تک نہ سنی، اقتدار و حکومت کو ہی سب کچھ سمجھ لیا۔ اس کا انجام جو ہونا تھا، وہی ہو رہا ہے۔ عالم اسلام کے ان ملکوں میں اس وقت جو بیداری دیکھنے کو مل رہی ہے، وہ وقت کا جبر بھی ہے اور تاریخ کی کروٹ بھی جس کو یہ حکمراں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وقت کے ساتھ عوام کے اندر تعلیم آئی ہے، ان کا سیاسی شعور بیدار ہوا ہے، مواصلات کی ترقی نے دنیا کو ایک گاؤں بنادیا ہے۔ اب جو ہوا دنیا کے کسی کونے میں چلتی ہے، دوسرے کونے تک پہنچتے دیر نہیں لگتی، ڈکٹیٹروں کے جبر و استبداد سے عاجز آچکے لوگوں پر ان کی گرفت وقت نے ڈھیلی کردی ہے، فوجی تانا شاہوں کی خاندانی حکومت کے خلاف عوام کے جذبات میں ابال کے لیے مہنگائی اور بیروزگاری نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اسی کے ساتھ عوام کے مختلف طبقات میں جو روایتی دوریاں تھیں ان میں کمی آئی، غلط فہمیاں، تعصبات، تحفظات اور منافرتیں دور ہوئیں، مسلکی و مذہبی ٹکراؤ میں تخفیف اور ایک دوسرے کے خلاف شکوک و شبہات، اندیشے اور خوف کے جذبات میں کمی نے اس طوفان کو جنم دیا جو تیونس سے مصر، لیبیا، شام، اردن، بحرین اور یمن تک پھیل گیا۔ گویا کہ یہ بتوں کے ٹوٹنے کا موسم ہے۔ یہ سب کے سب ایک ہی زمانے اور ایک سی فکر کے بنائے ہوئے بت ہیں جو اس وقت عوامی بیداری کے سامنے لرز رہے ہیں، ٹوٹ رہے ہیں، بکھر رہے ہیں۔ مسلم معاشروں کی زوال پذیری اور فکری جمود کے دور میں بیرونی طاقتوں کی مدد سے ان کو اپنے پیر جمانے اور قد اونچا کرنے کا موقع ملا لیکن اب جو ان بتوں کا گرنا شروع ہوا تو وہ اسی رفتار

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا؟ دنیائے عرب کا عوامی انقلاب۔ تسلسل

سے تابڑ توڑ گر رہے ہیں جس رفتار سے اور جس انداز میں یہ کھڑے ہوئے تھے۔ ویسے تو یہ سلسلہ تیونس سے شروع ہوا جب صدر زین العابدین بن علی کو ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا، پھر مصر اور اب لیبیا، یمن، شام، اردن اور بحرین میں بت ٹوٹ رہے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ سلسلہ بغداد کے فردوس اسکوائر سے شروع ہوا۔ دوسرا بت اس وقت ٹوٹا جب بغداد میں ایک عراقی صحافی منتظر زیدی نے صدر امریکہ بش پر جوتا پھینکا، تیسرا بت اس وقت ٹوٹا جب وہائٹ ہائوس میں ایک سیاہ فام صدر آ گیا۔

حال کے برسوں میں مسلمانوں کی آپسی دوریاں دور ہوئی ہیں، مسلک اور فرقوں، نظریات و عقائد کی دیواریں نیچی ہوئی ہیں۔ بہت سی گرہیں ڈھیلی پڑی ہیں۔ پچھلے دنوں مشہور مصری عالم دین علامہ یوسف القرضاوی نے ریاض (سعودی عرب) میں ایک سمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''میری خواہش ہے کہ سارے سلفی صوفی ہو جائیں اور سارے صوفی سلفی ہو جائیں۔'' کسی کو کیا معلوم تھا کہ ابھی ان کے اس قول کی بازگشت بھی ختم نہ ہوئی ہو گی کہ مصر کے لوگ سیلاب کی طرح سڑکوں پر اتر آئیں گے اور مسلک و مذہب کی سرحدیں ان کو ایک ہونے سے روک نہ سکیں گی۔ یہاں تک کہ حسنی مبارک اور اس کے صیہونی آقائوں کی مصر میں عیسائی مخالف فسادات اور فرقہ وارانہ تشدد پھیلانے کی سازشیں بھی کام نہ آئیں گی۔ دنیائے عرب کو سیاسی، سماجی اور جغرافیائی طور پر تین حصوں میں بانٹ کر دیکھا جا سکتا ہے: 1- جزیرۃ العرب کا وہ علاقہ جہاں سعودی عرب، عراق، کویت، یمن اور امارات واقع ہیں، اس خطے میں انقلاب کی لہریں زیادہ طاقتور نظر نہیں آتیں لیکن اضطراب سب سے زیادہ یہیں ہے۔ القاعدہ اسی خطے میں زیادہ مضبوط و متحرک ہے۔ تیل کی دولت اور سیاسی و دینی قیادتوں کے مضبوط گٹھ جوڑ نے یہاں جمہوریت پسند قوتوں کو دبا رکھا ہے لیکن جہاں بھی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے، وہ ابھر کر سامنے آ رہی ہیں، بحرین، یمن اور سعودی عرب کے بعض علاقوں کی صورت حال اسی حقیقت کی غماز ہے۔ 2- دوسرا حصہ وہ ہے جہاں دنیائے عرب کے قدیم تہذیبی و ثقافتی مراکز واقع ہیں مصر، شام، فلسطین اور اردن۔ اسی خطے میں عالم اسلام کا ناسور اسرائیل واقع ہے۔ یہی علاقہ عرب قومیت کی تحریکوں کا میدان عمل رہا ہے۔ یہاں کے لوگ سیاسی اعتبار سے نسبتاً بیدار ہیں۔ 3- تیسرا حصہ مغرب کا ہے جو مراقش، لیبیا، تیونس، موریطانیہ اور شمالی افریقہ کے دوسرے عرب ممالک پر مشتمل ہے۔ اس خطے میں جمہوریت کی لہر سب سے زیادہ مضبوط اور تیز ہے کیونکہ یہاں مسلکی منافرت اور بٹوارے کم ہیں۔ یہ ممالک یوروپ سے قریب ہیں اور یہاں صوفیا کے اثرات زیادہ ہیں۔ پچھلی صدی میں عالم اسلام میں فوجی انقلابات کا سلسلہ مصر کے انقلاب کے بعد تیز ہوا تھا۔ پہلے جمال عبدالناصر آئے، پھر بغداد، شام، لیبیا اور یہاں تک کہ پاکستان میں فوجی جرنیلوں نے حکومتوں کے تختے پلٹے۔ یہی جرنیل اس وقت مسلم قوموں کے ہیرو تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ہوا ترکی سے چلی تھی جہاں ایک فوجی انقلاب نے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے ترکی کو جدید سیکولر ملک بنا دیا تھا۔ اس کے بیس پچیس سال بعد ایک ایک کر کے مختلف ملکوں کی فوجوں نے حکومت کے تختے پلٹ دیے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ جمہوریت کی یہ تازہ ہوا بھی عالم اسلام میں ترکی سے چلی ہے۔ جہاں پچھلے عشرہ میں اسلام پسندوں کی حکومت اقتدار میں آئی اور ایک طویل جدوجہد کے بعد اقتدار پر فوج کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ اس وقت وہاں آئینی اصلاحات روبہ عمل ہیں اور ترکی میں 12 جون (2011) کو ہونے والا عام انتخاب 'نئے جمہوری آئین' کے موضوع پر ہوا ہے۔ اسلام پسندوں کی جماعت انصاف و ترقی پارٹی (اے کے پی) بھاری اکثریت سے منتخب ہو کر تیسری بار اقتدار میں آچکی ہے۔ آئین میں ترمیم گرانڈ اسمبلی میں ۲۶۷ سیٹوں کی درکار تھیں۔ اے کے پی اس ہدف کو تو نہ پا سکی لیکن ملک کے ۸۱ میں سے ۶۶ صوبے میں کامیاب ہوئی ہے اور ۵۵۰ کے ایوان میں ۳۲۷ نشستیں حاصل کی ہیں۔ یہ وہی ترکی ہے جہاں کل تک کمال اتاترک کے نافذ کردہ آئین کے خلاف زبان پر کوئی حرف لانا بھی ناقابل معافی جرم تھا۔ ترکی کی اس تبدیلی نے مشرق وسطیٰ کے اسلام پسندوں کو بھی متاثر کیا ہے اور وہ اب جمہوری طریقے سے تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ ایران میں اسلامی جمہوریت کی

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا؟ دنیائے عرب کا عوامی انقلاب۔ تسلسل

کامیابیوں نے بھی عرب نوجوانوں کو متاثر کیا ہے۔ وہ جب ان عجمی حکمرانوں کو مغربی طاقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے دیکھتے ہیں تو اپنے حکمرانوں پر ان کا غصہ اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل اور قبل از وقت ہوگا کہ یہ انقلاب عالم اسلام کو مستحکم کرے گا یا اسے مزید توڑ دے گا۔ کسی بھی عوامی انقلاب کی کامیابی اور ناکامی کو بہت سے عوامل متاثر کرتے ہیں اور اس کا انحصار اس قیادت کی دانشمندی پر ہوتا ہے جو اس انقلاب کی کوکھ سے ابھرتی ہے۔ اس کی بڑی واضح مثال برصغیر کی آزادی اور ہماری آزادی کے باسٹھ سال ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک ہی سرزمین کے دو حصے (ہندوستان اور پاکستان) ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں۔ سازشیں کہاں نہیں ہوتیں اور بیرونی طاقتیں ملکوں اور قوموں کے اندرونی انتشار سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں کہاں نہیں کرتی ہیں۔ آج ان ملکوں میں بھی کر رہی ہیں لیکن ہماری نگاہیں اس عوامی بیداری میں ایک بہتر مستقبل کے بیج دیکھ رہی ہیں۔ جن کی کونپلیں نکلنے میں دیر تو لگ سکتی ہے لیکن یہ بیج آسانی سے مرنے والے نہیں ہیں۔ اس طوفان سے نسبتاً جمہوری اور مستحکم عالم اسلام کے ابھرنے کی امیدیں کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ ان ملکوں کے عوام اسلام دشمن عناصر کے فریب میں نہ آئیں اور بیرونی طاقتوں کے کھلونے نہ بنیں۔

اسی تحریر سے

حال کے برسوں میں مسلمانوں کی آپسی دوریاں دور ہوئی ہیں، مسلک اور فرقوں، نظریات و عقائد کی دیواریں نیچی ہوئی ہیں۔

فکرِ فردا

انا ہزارے، کانگریس اور مسلمان



احمد جاوید

2025 / 06 / 18

احمد جاوید ؔ جس وقت اروند کیجریوال وشو ہندو پریشد کے اس دعوے کی تردید کررہے تھے کہ رام لیلا میدان میں انا ہزارے کی ستیا گرہ کے دوران کھانے پینے کے انتظامات ہندو پریشد کے لوگوں نے سنبھال رکھے تھے، اتفاق ہے کہ عین اسی وقت 'ندوہ' کے ایک فاضل نوجوان راقم سے یہ دریافت کررہے تھے کہ ونوبا بھاوے اور ان کی بھودان تحریک کو آر ایس ایس نے کس طرح استعمال کیا تھا؟ اور تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے لیے ان کو یہ سمجھا پانا مشکل تھا کہ ونوبا بھاوے ہندوستان کی تاریخ کا ایک بیحد مضبوط اور معتبر سیکولر سوشلسٹ کردار ہے، وہ ایک گاندھیائی رہنما تھے، اہنسا اور انسانیت کے اصولوں پر مرتے دم تک قائم رہے، سماج کے اس آخری شخص کی زندگی میں آزادی کی روشنی پہنچانا ان کی زندگی کا واحد نصب العین تھا، جس کی زندگی میں آزادی کی کرن نہ پہنچی تو گاندھی جی کی نظر میں آزادی ادھوری تھی، اپنی ایک ایک سانس انہوں نے گاندھی جی کے اصولوں کے لیے وقف کردی تھی، آر ایس ایس اور اس کی انتہا پسندانہ ثقافتی قوم پرستی کے سخت خلاف تھے، اتنے سخت خلاف کہ جب سارا سنگھ پریوار جیلوں میں بند تھا، اندرا گاندھی کی ایمرجنسی کو انہوں نے انوشاسن کا پرب قرار دیا تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آر ایس ایس نے ان کی تحریک کو اپنے کاز کے لیے استعمال کیا۔ اس تضاد کی تطبیق میرے لیے آسان نہ تھی کیونکہ ہم لوگ تصویر کا ایک رخ دیکھنے کے عادی ہیں اور جمہوری معاشرے کی پیچیدگیوں کی سمجھ آج بھی ہم میں بہت کم ہے۔ تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ تاریخ سے ہم سبق نہیں لیتے۔ انا ہزارے کی تحریک کوئی ایک دو دن کا قصہ نہیں ہے۔ یہ نہ تو راتوں رات کھڑی ہوگئی نہ وہ بھیڑ جو انا کے پیچھے کھڑی تھی، یونہی کھڑی ہوگئی تھی۔ اس کے پیچھے برسوں کی محنت اور ایک منظم و مسلسل جدوجہد تھی۔ جو لوگ اروند کیجریوال، ان کے 'پریورتن' اور پی سی آر ایف کو جانتے ہیں اور ملک کے طول عرض میں ان سے جڑے ہزاروں نوجوانوں کی آر ٹی آئی کے ہتھیار سے بدعنوانی کے خلاف جنگ کی سرگرمیوں کا علم رکھتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انڈیا اگینسٹ کرپشن کی اصل باگ ڈور کن ہاتھوں میں ہے اور وہ کتنے باشعور اور سنجیدہ لوگ ہیں۔ یہ وہی کیجریوال ہیں جنھوں نے بدعنوانی کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے محکمہ انکم ٹیکس کا اعلی عہدہ چھوڑ دیا، آر ٹی آئی لانے کی جنگ جیتی اور اس کے لیے ملنے والے اپنے میگسیسے ایوارڈ کی ساری رقم وقف کردی۔ پھر یہ کہ کیجریوال اور ان کی ٹیم نے پورے ایک سال پہلے اس مہم کی پلاننگ شروع کردی تھی، پہلے انا کو جوڑا۔ پھر کرن بیدی، پرشانت بھوشن، سنتوش ہیگڑے اور دوسری شخصیتوں کو جوڑنے میں کامیاب ہوئے، انہوں نے محسوس کیا کہ آج اس ملک میں قابل اعتماد عوامی قیادت کا جو خلا ہے اس کو اگر کوئی پر کر سکتا ہے تو وہ صرف وہ ہے جس میں لوگوں کو گاندھی جی کی جھلک نظر آسکے۔ خود انا ہزارے کو جو لوگ جانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ مہاراشٹر میں ایسی کتنی تحریکیں منظم کرچکے ہیں، کتنے قانون بنوا اور بدلوا چکے ہیں، وہ بنکروں، کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کے لیے انصاف کی لڑائی کب سے لڑ رہے ہیں، کس طرح مہاراشٹر کے ایک انتہائی پسماندہ، غریبی اور بدحالی کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے گاؤں کو دنیا کے نقشے پر لائے اور یہ ان کا پہلا انشن تھا یا وہ اس سے قبل تیرہ چودہ بھوک ہڑتال کرچکے ہیں۔ اگر اس کے باوجود ہم یہ کہیں کہ اس تحریک کے پیچھے اصل طاقت آر ایس ایس ہے تو آپ اس کو کیا کہیں گے؟ یہی نہ کہ ہم انا ہزارے کی شخصیت، ان کی برسوں کی جدوجہد، اروند کیجریوال اور ان کے پی سی آر ایف کی پوری ٹیم کی محنتوں اور سب سے بڑھ کر ملک کے ان کروڑوں نوجوانوں کی ایمانداری پر بیک جنبش قلم پانی پھیر رہے ہیں جو بغیر کسی لاگ لپیٹ اور سیاسی و نظریاتی وابستگی کے کرپشن کے

انا ہزارے، کانگریس اور مسلمان: تسلسل

خلاف ہیں اور اس کے سر سہرا باندھ رہے ہیں جو ہر گز اس کا اہل نہیں۔ لیکن یہی خیال ہمارے ان لیڈروں کو کیوں نہیں آیا جو انا ہزارے اور ان کی ٹیم کو آر ایس ایس کا آلہ کار ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ دراصل وہ یا تو اس مفروضہ پر ایمان لا چکے ہیں کہ اس ملک میں کوئی بڑی عوامی تحریک آر ایس ایس کے علاوہ کوئی اور منظم کر ہی نہیں سکتا یا پھر ان کی آنکھوں پر کوئی پٹی بندھی ہے جو ان کو یہ بھی نہیں دیکھنے دیتی کہ اگر آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کے پاس اتنی ہی طاقت ہوتی تو بی جے پی کی ریلیوں میں بھی سروں کا یہی سیلاب کیوں نہیں امڈ پڑتا؟ اس معاملے میں سب سے گھٹیا اور سوقیانہ کردار بعض مسلم قایدین نے ادا کیا، انہوں نے ملک کے بدعنوانی مخالف جذبات کے طوفان کے سامنے مسلمانوں کو کھڑا کر کے حکومت کو راحت پہنچانے کی کوشش کی۔ اور جہاں تک آر ایس ایس کا تعلق ہے تو ہر کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھنے کا ہنر کوئی سنگھ پریوار سے سیکھے۔ جو لوگ انا ہزارے کی تحریک کی کامیابی کا سہرا اس کے سر باندھنے پر تلے ہوئے ہیں، وہ ایک طرف انا اور ان کی ٹیم کو زبردستی سنگھ پریوار کے پالے میں دھکیل رہے ہیں، دوسری طرف اس تحریک سے پیدا شدہ لہر پر سوار ہو کر ووٹ کی فصل کاٹنے کی فضا بنانے میں بی جے پی کی مدد کر رہے ہیں۔ اروند کیجریوال کہہ رہے تھے کہ ”وی ایچ پی کا بیان گمراہ کن ہے۔ یہ ان کی تحریک کو بدنام کرنے کی سازش کا حصہ ہے۔ تحریک جب آگے بڑھی اور بھیڑ بڑھ گئی تو افراد اور جماعتوں کی ایک بڑی تعداد نے ان سے رجوع کرنا شروع کیا۔ وہ لوگوں کے لیے کھانے کے اسٹال لگانا چاہتے تھے۔ میرے پاس ایسی دس تنظیموں کی فہرست ہے جنہوں نے وہاں یہ اسٹالز لگائے تھے“۔ انہوں نے ان تنظیموں اور افراد کے نام نہیں بتائے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ ان میں سنگھ پریوار کے لوگ تھے یا نہیں تھے۔ اب اگر اشوک سنگھل یہ دعوی کر رہے ہیں کہ وشو ہندو پریشد نے کھانے کے اسٹالز لگوائے تھے اور کے این گووندا چاریہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں جو لوگ موجود تھے ان میں بڑی تعداد آر ایس ایس کے کارکنان کی تھی تو اس پر بوکھلانے کی بجائے سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بھیڑ میں گھس کر مقصد حاصل کرنا آر ایس ایس کا نیا وطیرہ نہیں ہے۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد آر ایس ایس پر جب زمینیں تنگ ہو گئیں تو اس کے لیڈروں اور پرچارکوں نے ونوبا بھاوے کی بھودان تحریک میں گھس کر نہ صرف اپنے سیاسی و سماجی وجود کو بچایا بلکہ بڑی چالاکی سے نئی زمینیں ہموار کیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت کسی اشوک سنگھل کی ہمت نہیں تھی کہ وہ یہ دعوی کرتا کہ سروودیہ کے سالانہ اجتماع میں آر ایس ایس کے کتنے کارکنان شریک تھے۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اس نے سوشلسٹوں کے کندھوں پر سوار ہو کر اپنا سیاسی قد بڑھایا۔ لیکن کیا اس کے لیے ونوبا بھاوے یا جے پرکاش نارائن ذمہ دار تھے؟ ان رہنماؤں کو دوش دینا سراسر حماقت ہوگی، یہ سیکولر طاقتوں کی ناکامی تھی جس نے فرقہ پرستوں کو ان سے فایدہ اٹھانے اور عوامی جذبات کا استحصال کرنے کا موقع دیا۔ بدقسمتی سے کانگریس ہر اس طاقت کو اپنے لیے خطرہ سمجھ لیتی اور اپنا دشمن بنا لیتی ہے، جس کے ساتھ عوامی حمایت ہو اور جو اسکے اشارے پر ناچنے سے انکار کر دے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ غریبی یا کرپشن جیسے مسئلے پر ٹکراؤ کا ماحول پیدا ہوتا، اور فرقہ پرست طاقتیں اس کا استحصال کرتیں۔ انا ہزارے کا موازنہ ایک طرف گاندھی اور جے پی سے کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف راہل سے۔ کہا جا رہا ہے کہ جو کام برسوں کی بھاگ دوڑ میں راہل نہ کر سکے، وہ انا نے یوں کر دکھایا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ راہل تو نئی امنگوں کی علامت نہ بن سکے، انا ہزارے نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے، وہ ان کی حمایت میں ہزاروں کی تعداد میں سڑکوں پر اتر رہے ہیں۔ اپنے سینے اور اپنے ماتھے پر ’میں انا ہوں‘ کی پٹی لگا کر گھوم رہے ہیں۔ ان پر جانیں قربان کر رہے ہیں، خود سوزی جیسا انتہائی قدم اٹھا رہے ہیں، کیونکہ انا اور ان کی ٹیم ان میں اعتماد اور امید کی کرن جگانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس کے محرکات و عوامل سے قطع نظر اس کے پیغام کو سننے، سمجھنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر کانگریس کے منصوبہ سازوں کو چاہیے کہ وہ اس پر پوری سنجیدگی سے غور کریں اور ملک کو جان بوجھ کر ایک خطرناک ٹکراؤ کی طرف نہ دھکیلیں۔ انا کا موازنہ گاندھی اور جے پی کی بجائے ونوبا بھاوے سے کیا جانا چاہیے جن کی بھودان تحریک نے کانگریس کے

سنڈیکیٹ کے مقابلے انڈیکیٹ کی زمین تیار کی تھی۔ ۱۹۶۷ء کے انتخابات میں کانگریس کی حالت انتہائی پتلی تھی۔ پارٹی بے جان ہوچکی تھی، لوگوں کے دلوں میں اس کے سرمایہ داروں کی پارٹی ہونے کا خیال راسخ ہوچکا تھا۔ پہلی بار وہ کئی ریاستوں میں اقتدار سے بے دخل ہوگئی تھی۔ لیکن اندرا گاندھی کے مقابلے کانگریس کی شکست اور پارٹی کے بٹوارے کے بعد کمزور ہونے کے بجائے اس میں نئی جان آگئی، غریبوں اور اقلیتوں میں کانگریس کے تئیں اعتماد پیدا ہوا۔ یہ دونوں طبقات کانگریس کے ساتھ مضبوطی سے جڑے جس کا ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں اسے فائدہ ہوا۔ تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی طفل مکتب کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ۱۹۷۱ء کی کامیابی میں ونوبا بھاوے اور ان کی بھودان تحریک کا کیا کردار تھا۔ لیکن اسی اندرا نے جب جے پرکاش نارائن کے ساتھ ٹکرائو کا راستہ اختیار کیا تو کیا انجام ہوا؟ ہندوستان کی سیاست کو جن رہنمائوں نے سب زیادہ متاثر کیا ہے، سنیاس ان میں ایک قدر مشترک رہا ہے، سماجی زندگی میں یہ ایک بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ گاندھی جی بھی ایک سنیاسی تھے، ونوبا بھی سنیاسی تھے اور جے پی بھی سرگرم سیاست سے سنیاس لے چکے تھے۔ ونوبا اور انا میں کئی مماثلتیں ہیں۔ ونوبا کا تعلق بھی مہاراشٹر سے تھا اور انا ہزارے بھی مہاراشٹر کے رہنے والے ہیں۔ دونوں میں کوئی برابری نہیں ہے لیکن وہ بھی گاندھیائی تھے یہ بھی گاندھیائی ہیں، انہوں نے بھی غریب کسانوں، مزدوروں اور بے زمینوں کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی، یہ بھی گاؤں اور غریبوں کی لڑائی لڑتے آئے ہیں، جن لوک پال بل پر سرکار کے جھک جانے کے بعد بہ ظاہر تنازعہ ختم ہوگیا ہے لیکن یہ خطرہ مزید بڑھ گیا ہے کہ ان کی تحریک کے کندھوں پر فرقہ پرست طاقتیں سوار ہوجائیں۔ اس خطرے سے نبٹنا بھی حکومت اور سیکولر طاقتوں کی ذمہ داری ہے۔ جو ٹکراؤ سے نہیں، حکمت اور دانائی سے ممکن ہے۔

اسی تحریر سے

احمد جاوید جس وقت اروند کیجریوال و شوہند و پریشد کے اس دعوے کی تردید کر رہے تھے کہ رام لیلا میدان میں انا ہزارے کی ستیا گرہ کے دوران کھانے پینے کے انتظامات ہندو پریشد کے لوگوں نے سنبھال رکھے...

فکرِ فردا

انا کے پیچھے کون؟ کانگریس نے تاریخ سے سبق نہیں لیا



احمد جاوید

2025 / 06 / 18

احمد جاوید

آپ نے میمنہ اور شیر کی یہ حکایت بارہا پڑھی سنی ہوگی۔اس مثال کو روزمرہ کی گفتگو میں بھی استعمال کرتے آئے ہوں گے۔اور نہیں تو کسی زور آور کو آئینہ دکھانے یا کسی کمزور کو وقت کی نزاکت سمجھانے کے لیے ہی سہی آپ کو یہ قصہ ضرور یاد آیا ہوگا۔ لیکن آپ نے اس حکایت کے اس پہلو پر شاید ہی کبھی غور کیا ہوگا جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ بکری کا بچہ دریا کے کنارے کھڑا تھا۔ شیر نے دیکھا تو اس کی نیت خراب ہوگئی۔اس نے اس غریب سے کہا: 'گستاخ بچے! تو نے میرا پانی کیوں خراب کیا؟' شیر کی دہاڑ سن کر بچہ لرز گیا۔ 'حضور! ابھی میں بہت چھوٹا ہوں۔ابھی اس لائق نہیں ہوا کہ دریا یہاں اتر سکوں'۔ شیر پھر دہاڑا 'تو تیری ماں نے خراب کیا ہوگا۔' میمنہ ایک بار پھر کانپ گیا۔ 'جناب عالی! میری والدہ محترمہ نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا۔ان کا تو کبھی ادھر گزر بھی نہیں ہوا۔ یہ تو میں ہوں کہ بھٹک کر تنہا اس جانب...' ابھی وہ اپنی بات بھی پوری نہ کر سکا تھا کہ شیر پھر دہاڑا 'گستاخ! زبان لڑاتا ہے' اور اسے دبوچ لیا۔ دیکھا آپ نے ایک کمزور میمنہ کے سامنے شیر کس طرح بہانے پر بہانے بناتا ہے، حیلے تراشتا ہے، اسے دبائو میں لینے اور مجرم باور کرانے کی سعی نامشکور کرتا ہے لیکن وہ جلد ہی عاجز آکر اپنی اصلیت پر آجاتا ہے۔ وہ پہلے بھی ایسا کر سکتا تھا لیکن یہ کون سی طاقت ہے جو اسے اس سے روکتی ہے؟ جی ہاں! آپ نے بالکل درست سمجھا۔ زندگی کے ہر معرکہ میں سب سے بڑی طاقت اخلاق کی طاقت ہوتی ہے۔ یہ اخلاقی قوت کی کمی ہے جو شیر کو میمنہ کے سامنے حیلے ڈھونڈنے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ جواز پر جواز پیش کرتا ہے، بار بار اپنا موقف بدلتا ہے، لیکن اس کی ہر کوشش رائگاں جاتی ہے اور اس کا نقاب اترنا تھا اتر جاتا ہے جو اسکی کھلی ناکامی ہے۔اس نے سمجھا تھا کہ وہ اپنی ہر دہاڑ کے ساتھ کامیابی سے قریب ہو رہا ہے لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ میرے نزدیک انا ہزارے اور حکومت کی کہانی بھی میمنہ اور شیر کی کہانی ہے۔انا چاہے اپنے مقصد میں کامیاب ہوں یا نہ ہوں لیکن کانگریس انا اور انکے ساتھیوں کو دبائو میں لینے کی ہر کوشش کے ساتھ ناکامی سے قریب ہو رہی ہے۔ وہ تو کہیے کہ ملک میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہیں ورنہ ایک طرف ایک گاندھیائی ستیا گرہی ہے اور دوسری طرف پوری حکومت واقتدار کی طاقت، ایک جانب چند سماجی خدمت گار ہیں اور دوسری طرف ایوان اقتدار کے منتخب نمائندے۔ جمہوریت اور تاناشاہی میں بنیادی فرق یہی ہے کہ وہاں میمنے ظل الٰہی کی شان میں گستاخی نہیں کر سکتے، یہاں شیر میمنہ کو آسانی سے دبوچ نہیں سکتا۔ کانگریس اور اسکی قیادت کا المیہ یہ ہے کہ اس نے خود اپنے ماضی سے بھی سبق لینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ جنگیں ہتھیاروں سے نہیں اخلاق کی طاقت سے جیتی جاتی ہیں اور اگر جنگ سیاسی ہو تو اور بھی قدم قدم پر احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔اس واقعہ کی مثالیں آج یہاں وہاں بکھری پڑی ہیں۔ ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں کہ جیتی ہوئی جنگیں شکست میں بدل جاتی ہیں اور فاتح طاقتیں کس طرح ناک رگڑنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ایک طرف تہاڑ جیل سے رام لیلا میدان تک تحریر اسکوئر کا منظر ہے اور دوسری طرف منموہن سنگھ اور ان کے سپہ سالاروں کی نارسائی۔ جس ٹکرائو کے راستے پر ملک بڑھ رہا ہے وہ نہ قوم کے حق میں بہتر ہے اور نہ کانگریس کے مفاد میں بہتر لیکن اس کو کیا کہیے گا کہ کچھ لوگ جان بوجھ کر اس کو بڑھا رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اس حکومت کو اب کرپشن، رشوت، اور بدعنوانیوں کے خلاف جدوجہد میں بھی کسی بیرونی طاقت کا ہاتھ نظر آنے لگا ہے۔اس وقت کانگریس کی قیادت جن ہاتھوں میں ہے، ان کی اکثریت ۱۹۷۰ء کے عشرے میں جوان تھی۔ بیشتر تو اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی سے قریب بھی تھے۔ کانگریس کے ترجمان راشد علوی بھی انہیں لیڈروں میں

انا کے پیچھے کون؟ کانگریس نے تاریخ سے سبق نہیں لیا تسلسل

سے ایک ہیں۔ان کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ آج ملک میں کرپشن کے خلاف اناہزارے کی مہم میں جو بیرونی ہاتھ دیکھ رہے ہیں،ایمر جنسی کے نفاذ کے وقت اندراگاندھی نے بھی ملک کے حالات کی خرابی کے لیے بیرونی طاقتوں کے اسی ہاتھ کو ذمہ دار قرار دیا تھا۔بات راشد علوی تک ہی محدود نہیں ہے،خود وزیراعظم بھی یہی کہہ رہے ہیں۔وہ اناہزارے کے خلاف پولس کارروائی کو جائز ٹھہراتے ہوئے یہ کہنا نہ بھولے کہ 'ہندوستان عالمی سطح پر ایک اہم ملک کے طور پر ابھر رہا ہے اور کچھ طاقتیں نہیں چاہییں کہ ہندوستان اپنا اصل مقام حاصل کرے۔ ہمیں ان طاقتوں کے ہاتھوں میں نہیں کھیلنا چاہیے'۔اب ملک کی اپوزیشن پارٹیاں اور خاص طور پر بائیں بازو کی جماعتیں ان سے وضاحت طلب کر رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ وزیراعظم کا یہ بیان ایمر جنسی کے دور میں اپنے مخالفین کے لیے اندراگاندھی کے ریمارکس کی یاد دلا رہا ہے۔ہم اس پر یہ اضافہ کرنا چاہیں گے کہ جب جے پرکاش نارائن کی مکمل انقلاب کی اپیل کے مقابلے میں بیرونی طاقتوں کے خلاف اندراگاندھی لوگوں کو اپنے ساتھ کھڑا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھیں تو کیا منموہن سنگھ اور ان کے مشیروں وزیروں کی جماعت انا کی مہم کے مقابلے اس بیرونی ہاتھ کے خلاف ملک کے عوام کو اپنے ساتھ کھڑا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ منموہن سنگھ ملک کے سربراہ ہیں انکے کسی بیان کو ہلکے مین نہیں لیا جاسکتا۔وہ اگر کہہ رہے ہیں کہ ملک میں پیدا ہونے والے حالات کسی بیرونی طاقت کی کارستانی ہیں تو پھر ملک کے عوام میں بے چینی پیدا ہونا لازمی ہے۔انہیں صاف صاف بتانا چاہیے کہ وہ کون سی طاقتیں ہیں جو ہندوستان میں کرپشن کیخلاف مہم کو ہوا دے رہی ہیں اور اس کے پیچھے ان کے کیا مقاصد ہیں؟ ہمیں ان طاقتوں کو کھل کر جواب دینا چاہیے۔یہ صرف ملک کے وقار اور وزیراعظم کی اخلاقی جرأت کا تقاضہ ہی نہیں، سربراہ مملکت پر ملک کے عوام کے اعتماد کا مسئلہ بھی ہے ورنہ لامحالہ یہی سمجھا جائے گا کہ وہ ملک و قوم کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔اس سے قطع نظر کہ اناہزارے کی کردار کشی یا انا اور ان کے ساتھیوں کے خلاف پروپیگنڈے کا ردعمل کیا ہوگا،ان کے پیچھے آرایس ایس کا ہاتھ دیکھنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے لیکن کیا اس منفی سوچ پر بھروسہ کرکے کہ آرایس ایس کی لال چھتری سے ملک کے سیکولر عوام بدک جائیں گے اور اس تحریک کا ہمارے ووٹ بینک پر کوئی اثر نہیں پڑیگا،کانگریس وہی غلطی نہیں دوہرائے گی جو اندراگاندھی نے ایمر جنسی کے دوران کی تھی۔بے شک آرایس ایس اور اس کی ذیلی تنظیموں نے ماضی میں بھی،اس قسم کی عوامی تحریکوں کا اپنی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ونوبابھاوے کی بھودان یگیہ اور جے پی آندولن اس کی مثالیں ہیں لیکن بہ غور دیکھیں تو اس کے لیے اصل ذمہ دار کانگریس تھی جس نے حالات کے تقاضے،وقت کی نزاکت اور عوام کے جذبات کو سمجھنے سے انکار کرکے ٹکراؤ کے رجحان کو فروغ دیا۔جس کی فصل اسے خود بھی کاٹنی پڑی اور ملک و قوم کو بھی قیمت چکانی پڑی۔تارک الدنیا فقیروں اور سنیاسیوں کو احترام و عقیدت کی نظر سے دیکھنے کی اس ملک میں بڑی مضبوط روایت رہی ہے۔ملک کی سیاست میں جب بھی کوئی سنیاسی آیا ہے،عوام نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔جے پرکاش نارائن بیشک ایک سوشلسٹ سیاستداں تھے لیکن وہ عملی سیاست سے سنیاس لے چکے تھے۔یہ ایک اخلاقی طاقت تھی جس کا مقابلہ اخلاقی طاقت سے ہی کیا جاسکتا تھا لیکن اندراگاندھی نے اسے بزور قوت کچلنے کی کوشش کی اور کم و بیش یہی غلطی کانگریس پھر دوہرا رہی ہے۔

فکرِ فردا

امریکہ اور پاکستان کی کشمکش: افغانستان میں تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے



احمد جاوید

2025 / 06 / 18

افغانستان کا مستقبل پھر بیرونی طاقتوں کا تختہ مشق بن گیا ہے۔ پھر وہی حالات سامنے ہیں جن حالات نے طالبان کو جنم دیا اور اقتدار تک پہنچایا تھا، فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت امریکہ نے چشم پوشی کرلی تھی لیکن اس بار وہ اس سے سخت پریشان ہے کیونکہ آج اس دلدل میں وہ خود پھنسا ہوا ہے، اس کا اپنا مستقبل، معیشت، اور فوجیں داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔

فکر فردا احمد جاوید

جمعہ کو خبر آئی کہ صدر بارک اوبامہ نے پاکستان کی فوج اور انٹلی جنس سروسز کے مخصوص انتہا پسندوں سے روابط پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ واشنگٹن کے لیے پریشان کن ہے اور اسی کے ساتھ افغانستان میں بیرونی طاقتوں کی مفادات کی جنگ پر پاکستان کو نصیحت کی ہے کہ وہ اب بھی ہندوستان کو اپنا دشمن سمجھتا ہے حالانکہ اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ”ہندوستان کے تئیں پرامن طرز فکر و عمل ہی ہر ایک کے مفاد میں ہوگا۔“ تو میرا ذہن ماضی کے ان دھندلکوں میں کھو گیا اور دیر تک کھویا رہا جب طالبان کا ہیولہ تیار ہو رہا تھا۔ لگا کہ افغانستان کی تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے، پھر وہی حالات بن رہے ہیں جن حالات نے طالبان کو جنم دیا اور اقتدار تک پہنچایا تھا، فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت امریکہ نے چشم پوشی کرلی تھی لیکن اس بار وہ اس سے سخت پریشان ہے کیونکہ آج اس دلدل میں وہ خود پھنسا ہوا ہے، اس کا اپنا مستقبل، معیشت، اور فوجیں داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔ صدر اوبامہ نے اگرچہ کسی کا نام نہیں لیا ہے لیکن حقانی گروپ سے پاکستان کے روابط پر امریکہ اور پاکستان کے اعلی حکام اور وزراء کی لفظی جنگ کے بعد ان کے اس بیان سے کہ ”اب اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے کہ پاکستانی فوج اور انٹلی جنس سروسز کے ان خاص افراد سے روابط ہیں جن سے ہمیں پریشانی ہے“، ساری کہانی خود بہ خود سامنے آجاتی ہے۔ پھر یہ احتیاط کہانی کا دوسرا رخ بھی پیش کردیتی ہے کہ وہ ان ’خاص افراد‘(certain individuals) کے لیے دہشت گرد جیسے الفاظ استعمال نہیں کرتے، غیر محفوظ و ناقابل بھرسہ یا زیادہ سے زیادہ خطرناک کردار کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور کسی تنظیم کا نام بھی نہیں لیتے۔ امریکہ کی اصل مشکل یہ ہے کہ ایک طرف تو اسے افغانستان میں اس طاقت کی تلاش ہے جو اسے اس دلدل سے نکلنے کا محفوظ راستہ دلا سکے اور امید کی موہوم سی کرن حقانی میں ہی نظر آرہی ہے۔ دوسری طرف ابھی وہ یہاں سے نکلنے کی تیاری ہی کر رہا ہے کہ اس سنگلاخ سرزمین میں ایک بار پھر بیرونی طاقتوں میں مفادات کی وہی جنگ چھڑ گئی ہے جو افغانستان سے سوویت افواج کی پسپائی کے بعد چھڑ گئی تھی۔ وہی مناظر ہیں، ہندوستان، ایران اور روس ایک طرف ہیں، پاکستان اور چین ایک طرف اور امریکہ ایک طرف جبکہ افغانوں کی آپسی رنجشیں، رقابتیں اور روایتی عداوتیں اپنی جگہ ہیں۔ کابل ہندوستان اور ایران کی طرف بڑھ رہا ہے کیونکہ وہ اپنی موجودہ قابل رحم حالت کا سب سے بڑا ذمہ دار پاکستان کو ہی تصور کرتا ہے۔ افغانستان کی ۸۰ فیصد آبادی پاکستان سے آج سخت بیزار و متنفر ہے حتی کہ طالبان بھی جن کی نشو و نما پاکستان میں ہی ہوئی تھی۔ کابل کے تاجک تو پاکستان کو اپنے ہیرو احمد شاہ مسعود کا قاتل تصور کرتے ہیں اور پروفیسر ربانی کے قتل نے ان کے پرانے زخموں کو تازہ کردیا ہے۔ ایسی صورت میں اسے امید کی کرن حقانی اور ان طالبانی عناصر میں نظر آتی ہے جو کسی نہ کسی سطح پر اب بھی آئی ایس آئی سے روابط بنائے ہوئے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ پاکستان ایک بار پھر اپنے مفادات کا تحفظ افغانستان کی ان ہی طاقتوں میں دیکھ رہا ہے، جن کو روسی افواج کی پسپائی کے بعد خانہ جنگی کے زمانے اس نے آگے بڑھایا تھا اور جن کی مدد سے وہ طالبان کو اقتدار میں لانے میں کامیاب ہوا تھا۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے تو وہ

امریکہ اور پاکستان کی کشمکش: افغانستان میں تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے تسلسل

ابھی چند ماہ پیشتر جلال الدین حقانی اور ان کے بیٹے سراج الدین حقانی سے مذاکرات میں مصروف تھا، قطر اور جرمنی ثالثی کر رہے تھے اور صدر حامد کرزئی نے حقانی جونیئر کو وزیر اعظم کے عہدہ کی پیشکش تک کر دی تھی۔ گویا نہ امریکہ کا یہ دعوی جھوٹ ہے کہ حقانی گروپ سے آئی ایس آئی اور پاکستانی افواج کے گہرے روابط ہیں اور نہ پاکستان کا یہ جواب دعوی کہ اس گروپ کو سی آئی اے کی امداد حاصل رہی ہے۔ بلاشبہ روسی تسلط کے خلاف اسے ہر قسم کی امداد اور ٹریننگ سی آئی اے نے دی۔ امریکی کانگریس کے رکن چارلی ولسن جنہوں نے افغان جہاد میں لاکھوں ڈالر لگائے، جلال الدین حقانی کو نیکیوں کا پتلا (goodness personified) کہا کرتے تھے۔ اسٹیو کول کی کتاب 'دی بن لادنس' The Bin Ladens) میں تفصیلی ذکر موجود ہے کہ انہوں نے سی آئی اے سے نقد اور ہتھیار دونوں حاصل کیے۔ امریکہ اور پاکستان کے حلیفوں میں کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔ عرب ملکوں کی سب سے زیادہ سپورٹ انہیں، پھر استاد سیاف کو حاصل تھی۔ نجیب اللہ کی حکومت سے جنہوں نے سب سے پہلے کوئی شہر چھینا تھا، وہ حقانی تھے اور یہ شہر خوست تھا۔ اور ۱۹۹۲ء میں ان کو عبوری حکومت کا وزیر انصاف مقرر کیا گیا تھا۔ حقانی کی طاقت، پاکستان سے ان کے گہرے روابط اور ان سے اپنے پرانے تعلقات کے سبب امریکہ کو حقانی گروپ سے یہ امید تھی کہ وہ اسے افغانستان کے دلدل سے نکالنے میں مدد کریگا اور اب بھی وہ یہی کہہ رہے ہیں کہ ''یہ طالبان نہیں ہیں لیکن طالبان سے تعاون کر رہے ہیں''۔ در اصل جلال الدین حقانی افغانستان کے صوبہ پکتیا کے پشتو قبیلہ جدران سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ علاقہ پاکستان سے تین طرف سے گھرا ہوا ہے اور پاکستانی وفاق کے زیر انتظام قبائلی خطہ (فاٹا) سے متصل ہے، پھر ان کو پاکستان کا اعتماد بھی حاصل رہا ہے اور ان کی اسی خوبی کی وجہ سے ان کو سی آئی اے کی زبردست حمایت حاصل رہی ہے۔ روسی تسلط کے خلاف افغان جہاد کے دور میں وہ مولوی محمد یونس خالص کے حزب اسلامی کے رکن تھے جن کو صدر رونالڈ ریگن نے وھائٹ کا مہمان بنایا تھا۔ رپورٹیں بتاتی ہیں کہ افغان پاک سرحد پر واقع اس وسیع و عریض خطہ میں آج اس گروپ کی متوازی حکومت قائم ہے، اسی علاقہ سے وہ شاہراہیں گزرتی ہیں جن سے روزانہ ہزاروں ٹرک افغانستان آتے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ان کی اجازت اور ان کو ٹیکس ادا کیے بغیر یہاں سے گزر نہیں سکتا۔ بیرونی دنیا سے حقانی کے پرانے روابط اب بھی قائم ہیں، نیویارک ٹائمز کی مانیں تو اب بھی غیر ملکی مجاہدین اور بیرونی امداد ان کو مل رہی ہیں۔ خود امریکی انٹلی جینس ذرایع کے مطابق پاکستان کے میراں شاہ (شمالی وزیرستان) اور افغانستان کے خوست، وردک، لوگر، اور غزنی وغیرہ پر پھیلی ہوئی حقانی کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے جہاں اس کے محصولات کے دفاتر، عدالتیں، مدرسے، اور یہاں تک کہ موٹر گاڑیاں بیچنے والی کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں امریکہ کے مسلسل ڈرون حملوں کے بعد بھی اگر یہ سب کچھ محفوظ ہیں، ان کا نیٹ ورک کام کر رہا ہے اور حقانی خاندان کا بال بیکا نہیں ہوا ہے تو اس کا راز کیا ہے؟ یہ غالبا ۱۹۸۲ء کے اواخر کی بات ہے۔ اس وقت تک افغان مجاہدین لال فوج کے خلاف الگ الگ اور اپنے اپنے حلقہ اثر کے لحاظ سے مزاحمتی کارروائیاں کر رہے تھے۔ پروفیسر برہان االدین ربانی نے افغان لیڈروں کو ایک چھت کے نیچے بٹھایا اور ان کو منظم کر کے سات جماعتی اتحاد تشکیل دیا۔ ان سات دھڑوں کے لیڈر مولوی یونس خالص، گلبدین حکمت یار، استاد برہان الدین ربانی، مولوی غلام نبی محمدی، پروفیسر صبغت اللہ مجددی، پیر سید احمد شاہ گیلانی اور استاد عبد الرسول سیاف تھا۔ اسی اتحاد نے افغانستان میں تاریخ کی طویل ترین گوریلا جنگ لڑی اور کامیابی حاصل کی۔ لیکن اسے اس کے ثمرات نصیب نہیں ہوئے۔ در اصل روسی افواج کے خلاف مجاہدین کی جنگ ابھی اپنے شباب پر تھی اور آثار نمودار ہو چکے تھے کہ اس اتحاد کی فتح ہو گی، ان ہی دنوں پتہ نہیں کن لوگوں نے استاد عبد الرسول سیاف پر ایسی محنت کی کہ وہ جلد ہی سلفی المسلک ہو گئے۔ پھر انہیں سلفی المسلک سعودیوں کی زبردست حمایت حاصل ہو گئی۔ بتدریج ان پر نئے مسلک کا غلبہ اتنا بڑھا کہ استاد عبد الرسول سیاف نے اپنا نام بدل کر عبد الرب رسول سیاف کر لیا۔ ایسے لوگ عموما مسلک کو دین سمجھ لیتے ہیں اور

امریکہ اور پاکستان کی کشمکش: افغانستان میں تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے تسلسل

دوسرے مسلمانوں کو بے دین، کافر و مشرک بلکہ قابل گردن زدنی۔ افغانستان میں طالبان کی یہ خشت اول تھی جس نے آگے چل کر دنیا کی سب سے طاقتور فوج کو پسپا کر دینے والے اتحاد کا شیرازہ بکھیر دیا۔ کیونکہ اول الذکر دونوں دھڑوں کا اثر و رسوخ اہل سنت کے علما و مشائخ ہیں تھا، بقیہ دھڑے بہت چھوٹے تھے۔ استاد سیاف کی تبدیلی مسلک اور اپنے نئے مسلک کے تئیں ان کی شدت نے اتحاد کا ایسا شیرازہ بکھیرا کہ عرصہ دراز تک خانہ جنگی جاری رہی۔ استاد ربانی اور ان کی جمعیۃ سیاف کے شمالی اتحاد میں شامل ہو گئی اور ان کا اساطیری شہرت کا حامل گوریلا کمانڈر احمد شاہ مسعود حکمت یار خاں پر پل پڑا۔ یاد رہے کہ اسامہ بن لادن شمالی اتحاد کے لیڈر سیاف کی دعوت پر ہی ۱۹۹۶ء میں سعودی عرب سے افغانستان آیا تھا۔ بعد میں جب طالبان نے کابل پر غلبہ حاصل کر لیا تو اپنی پناہ میں لے کر اسے قندھار منتقل کیا۔ اسامہ کو طالبان حکومت کا مہمان بنانے میں حقانی کا کلیدی رول تھا۔ کیونکہ طالبان کو اقتدار میں لانے اور ان کے اقتدار کو مضبوط کرنے میں حقانی کا کلیدی کردار تھا۔ وہ اس سے قبل عبوری حکومت میں وزیر انصاف رہ چکے تھے۔ خانہ جنگی کے زمانے میں زیادہ طاقت کے ساتھ ابھرے، طالبان کا ظہور ہوا تو وہ ان کے ساتھ تو نہیں تھے لیکن کابل پر طالبان کا قبضہ ہو جانے کے بعد ان کی حکومت میں شامل ہو گئے، اس وقت تک شمالی اتحاد کی حکومت کو امریکہ اور سعودی عرب کے ساتھ ساتھ پاکستان کی حمایت بھی حاصل تھی جس کے سربراہ پروفیسر ربانی بدخشاں میں پناہ لے چکے تھے لیکن طالبان کا غلبہ جیسے جیسے بڑھتا گیا، یہ حمایت ان کی جانب منتقل ہوتی گئی جبکہ طالبان کے مقابلے پر شمالی اتحاد کو ہندوستان، روس اور ایران کی تائید حاصل تھی جس کو پاکستان مخالف گٹھ جوڑ تصور کیا جاتا تھا۔ جن دنوں افغانستان پر روسی افواج اور اشتراکیت پسندوں کا تسلط قائم تھا، روسی مظالم کی لرزہ خیز خبریں سنکر کراچی کے مشہور مدرسہ جامعہ بنوریہ ٹاؤن سے طلبا کی ایک جماعت افغانستان گئی جس کی قیادت ارشاد حسین نام کا ایک طالب علم کر رہا تھا۔ یہ جماعت غلام نبی محمدی کی جماعت میں شامل ہو گئی۔ پھر پاکستانی طلبہ کی کئی کھیپ وہاں گئی اور مولوی محمدی کا دھڑا نسبتا مضبوط ہونے لگا لیکن بعد میں ان کا اختلاف ہو گیا اور ان طلبہ نے مولانا فضل الرحمان خلیل کی سرپرستی میں حرکۃ الجہاد الاسلامی بنائی۔ حرکۃ المجاہدین اور حرکۃ الانصار اسی سے پیدا ہونے والی تنظیمیں ہیں۔ اسی طرح حزب اسلامی سے حرکۃ انقلاب اسلامی پیدا ہوئی۔ طالبان کا تیسرا گروہ وہ تھا جن کو پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں سرگرم عمل کیا تھا۔ اپنے مسلک کو فروغ دینے کے حریص طلبا اور علما کے جتھوں کے جتھے ان سرحدی علاقوں میں بھیجے گئے جنہوں نے وہاں بڑے پیمانے پر تشدد کا بازار گرم کیا۔ حتی کہ مقامی شیعہ اور آغا خانی آبادیوں کی جائدادیں تک غصب کر لی گئیں۔ یہ مہم اس خطے کی آبادی کی بناوٹ تبدیل کرنے کی پاکستان کی منصوبہ بند کوشش تھی۔ طالبان کا چوتھا گروہ وہ تھا جو ۱۹۹۵ء کے آس پاس افغان پاک سرحد پر واقع چمن، اسپین بلدوک کے علاقے اور قندھار کے ایک مدرسہ سے ابھرا۔ چمن کے علاقے میں واقع مولانا سمیع الحق کا مدرسہ اس کا بھرتی کیمپ بن گیا۔ وہ جمعیۃ علمائے اسلام (پاکستان) کے ایک دھڑے کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں زبردست اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ جمعیۃ علمائے اسلام کے دوسرے دھڑے کے سربراہ مولانا فضل الرحمان کے بھی طالبان لیڈروں سے گہرے مراسم تھے، قندھار کے طلبہ کی اس نئی تحریک نے افغانستان کو اس طویل خانہ جنگی سے نجات دلائی جو سوویت یونین کی پسپائی کے بعد پھوٹ پڑی تھی۔ اس سے آگے کی کہانی یہاں دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے، صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ شمالی وزیرستان اور خوست کا وہی خطہ حقانی گروپ کا ملٹری بیس ہے اور ایک بار پھر پاکستان وہی بساط بچھا رہا ہے، اور اس کے مخالفین بھی وہی کھیل کھیلتے نظر آ رہے ہیں جو انہوں نے اس وقت کھیلا تھا۔ تاجک رہنما اور افغانستان کے نائب صدر محمد قاسم فہیم جس وقت کابل میں کہہ رہے تھے کہ اگر اپوزیشن نے ہمارا ساتھ نہیں دیا تو افغانستان ہمسایہ ملک (پاکستان) کا صوبہ بن جائے گا، عین اسی وقت نئی دہلی میں صدر حامد کرزئی اور وزیر اعظم منموہن سنگھ ہند افغان اسٹریٹیجک اشتراک کے معاہدہ پر دستخط کر رہے تھے۔

A D V E R T I S E M E N T



ثقافت

فکر سے مکالمے تک

مزید مضامین، کالم اور تازہ شمارے

ثقافت کی ویب سائٹ پر

SAQAFAT.NET

AHMAD JAWED
FOUNDATION

جلد اول • شمارہ اول • ستمبر ۲۰۲۶
مکمل ڈیجیٹل اشاعت: اکتوبر ۲۰۲۶